بچّوں کی نشوونما

تصنیف۔ ولارڈ سی، اولسن، جون لی ولن ۔ ترجمہ، شاہد احمد دہلوی

سفینۂ ادب ☆ لاہور

بچوں کی نشوونما

www.KitaboSunnat.com

الحسنی
شاہی بازار بہاولپور

بچوں کی نشوونما

تصنیف

دلارڈ سی، اولسن و جون لی ولن

ترجمہ

شاہد احمد دہلوی

سفینۂ ادب، لاہور

This is an authorized Urdu Translation of HOW CHILDREN GROW AND DEVELOP by Willard C. Olson and John Lewellen. Copyright 1953 by Science Research Associates, Inc. Published by Science Research Associates, Inc,. Chicago, Illinois.

مطبع ــــــــــ شاہ اینڈ سنز پریو سس پرنٹرز۔ لاہور
قیمت ــــــــــ سولہ روپے پچھتر پیسے

سفینۂ ادب، لاہور

فہرست مضامین

صفحہ

پہلا باب

ساری نشوونما ایک خاص انداز کے مطابق ہوتی ہے

نیا سال شروع ہونے پر شہر کے ایک اسکول نے کنڈرگارٹن میں داخلہ لینے والے بچوں کی ماؤں کو یک جا ہونے کی دعوت دی۔ استانی نے انہیں بتایا کہ اس اسکول میں پڑھنے والے بچے سال بھر میں کیا سیکھ سکیں گے جو توقعات استانی نے بچوں سے وابستہ کی تھیں انہیں سن کر ماؤں کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی، مگر جب استانی نے کہا کہ کنڈرگارٹن میں داخل ہونے والے ہر بچے کو اپنے جوتوں کی ڈوریاں باندھنی آنی چاہییں تو اکثر ماؤں کے منہ حیرانی سے کھل گئے۔

جن بچوں کو اپنے جوتوں کی ڈوریاں باندھنی نہیں آتی تھیں ان کی مائیں

انہیں سکھانے پر تل گئیں۔ چار چار پانچ پانچ سال کے ان "بھنڈی" بچوں سے ان کے جوتوں کی ڈوریاں بندھوانے کے لیئے وہ اپنا مغز پچی کرتی رہیں۔ جمیل اور سوسن کو انھوں نے سمجھایا کہ دوہری گرہ لگانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے خرگوش اپنے بھٹ میں سے ادھر بھاگے، اُدھر بھاگے، اور پھر اُچھل کر اپنے بھٹ میں گھس جائے، مگر سمجھانے کی ساری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مائیں جھلا گئیں اور بچے رونے لگے۔

اِن کی کوششیں قبل از وقت تھیں:- جو بچے ڈوریاں باندھنا نہ سیکھ سکے وہ ضدی یا ضدی نہیں تھے۔ ان میں اتنا شعور پیدا نہ ہوا تھا کہ اس سیدھے سادے سے کام کے لیئے اپنی انگلیوں کو مناسب حرکت دے سکیں، اور جب تک ان میں اتنا شعور پیدا نہ ہو جائے دنیا کی کوئی قوت انہیں ڈوریاں باندھنا نہیں سکھا سکتی۔

بنا بنایا ٹائم ٹیبل:- جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بچہ سیکھنے کے لیئے "تیار" ہو تو اس سے ہمارا کیا مطلب ہوتا ہے! مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر بچے میں اس کے اپنے نشوونما کا ایک کینڈا ہوتا ہے جس کی پیروی وہ زندگی بھر کرتا ہے۔ اور یہ کینڈا ٹائم ٹیبل کی سی باقاعدگی کے ساتھ بروئے کار آتا رہتا ہے۔ جو بچے ایسے کینڈے کے ہوتے ہیں جو انہیں ہر معاملے میں تیزی سے پختگی حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے "جلد پختہ ہونے والے" کہلاتے ہیں۔ جو بچے جسمانی، ذہنی، یا جذباتی لحاظ سے بہ اعتبار عمر پیچھے رہ جاتے ہیں "دیر میں پختہ ہونے والے" کہلاتے ہیں۔ ان دونوں

کے درمیان بڑی تعداد ان بچوں کی ہوتی ہے جو "اوسط" درجے کے کہلاتے ہیں۔
مثال کے طور پر سلیم نے چار سال کی عمر میں پڑھنا سیکھ لیا۔ اس کے
بھائی کلیم نے چھ سال کی عمر میں پڑھنا سیکھا۔ سلیم ۱۴ سال کا تھا جب وہ
لڑکیوں کسے دلچسپی لینے لگا۔ کلیم کی ۱۶ سال کی عمر سے پہلے لڑکیوں سے
دلچسپی نہ ہوئی۔ مگر اسکول میں ایک ہی جیسے مضامین میں دونوں یکساں طور
پر اچھے تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایک ہی خاندان کے دو بچوں کی نشو و نما ایک
جیسی نہیں ہوتی یا دونوں کی نشو و نما ایک رفتار سے نہیں ہوتی۔ اگر ہم بچوں
کے مختلف پہلوؤں کے عمل کی ہیجان انگیزی سے واقف ہو جائیں تو بچوں
کو پختگی حاصل کرنے میں بہت مدد دے سکتے ہیں۔

نشو و نما محض جسمانی نہیں ہوتی۔ بچوں کی زندگی کے مختلف حصوں
میں نشو و نما ہوتی ہے۔ ہم عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کا قد اور وزن بڑھ رہا ہے۔
جسمانی تبدیلیاں تبدیلیاں اس قدر نمایاں ہوتی ہیں کہ ہم انہیں فوراً دیکھ لیتے
ہیں۔ اگر گیارہ سال کا حمید چھٹی جماعت کے سب بچوں سے پانچ انچ لمبا ہے
اور اس کا وزن ۱۰۰ پونڈ ہے تو ہم دیکھتے ہی جان جاتے ہیں کہ اس کا سبب
اس کی جسمانی نشو و نما ہے۔ اگر چھ سال کی عمر والوں میں نجمہ سب سے
چھوٹے قد کی ہے تو ہم اسے دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ اس کی نشو و نما دوسروں
کے مقابلے میں کم ہو رہی ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جب ہمارا
بچہ پیٹ کے بل کھسکنا شروع کرتا ہے، یا چلنے اور دوڑنے لگتا ہے

تو یہ اس کی جسمانی نشوونما کے مدارج ہوتے ہیں، لیکن بچوں کی نشوونما معاشرتی اور ذہنی اعتبار سے بھی ہوتی رہتی ہے مذکورہ بیرونی تبدیلیوں کے ساتھ بچے میں اندرونی

سگے بھائی بہنوں کی نشوونما بھی ایک سی نہیں ہوتی

تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں بچے کے سوچنے، محسوس کرنے اور کام کرنے میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ اتنی نمایاں نہیں ہوتیں، جتنی قد و قامت کی تبدیلیاں۔ مگر وہ اتنی ہی حقیقی ہوتی ہیں۔ اپنے گھر والوں یا بچوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے بچوں میں بعض اس قدر نازک تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں کہ ہمارے لئے اُن کا ادراک مشکل ہو جاتا ہے۔

ماحول:۔ بچے کے گھر اور اسکول کی زندگی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کہ جسمانی، معاشرتی ذہنی اور جذباتی نشوونما کے لئے بچہ اپنی ودلیعت شدہ
صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا سکے گا یا نہیں بچہ اپنی صلاحیتوں
سے بڑھ کر کام نہیں کر سکتا۔ چاہے اسے اچھی اچھی غذائیں کھلائی جائیں،
چاہے چیکارا پچکارا جائے۔ اور چاہے مارا پیٹا جائے۔ تاہم اس کی پوشیدہ
صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لیے اُسے موقع ملنا چاہیئے
کہ اپنی بڑھوتری کے کینڈے کے مطابق جتنی جلدی بھی وہ بڑھ سکے اور سیکھ
سکے نشوونما حاصل کرے۔ اگر دنیا کے سب سے قابل بچے کو دُور کسی
غیر آباد جزیرے میں چھوڑ دیا جائے تو اُسے کبھی پڑھنا لکھنا یا حساب کرنا
نہیں آئے گا۔ اُسے سیکھنے کا وہ موقع نہ ملے گا جو کسی اور پڑھنے لکھنے کے
ماحول میں مل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کا ماحول، یعنی وہ حالات جن
میں وہ گھرا رہتا ہے۔ اس کی کلّی نشوونما کے لیئے بے حد ضروری ہوتا ہے۔
ہم سب کے علم میں ایسے لوگ ہیں مثلاً دفتر کا منشی جسے اگر مناسب
تربیت ملتی تو وہ ایک بڑا فنکار بن جاتا۔ یا ایک کارخانہ کا مزدور کہ اگر اُسے
مواقع حاصل ہوتے تو ایک کامیاب تاجر بن جاتا۔ ان لوگوں میں نشوونما کی
جو توانائی تھی اسے نظر انداز کیا گیا اور ضائع ہو جانے دیا گیا۔ معاشرے
کو کلرکوں اور کارخانے کے مزدوروں کی ضرورت ہے، مگر ان میں بعض لوگ
ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی قابلیتوں کو اگر نشوونما کا موقع ملتا تو وہ دنیا کو ہمارے
لیے بہتر مقام بنا دیتے۔

نشوونما کے علم کی افادیت:۔ اگر ہم بچوں کی علیحدہ علیحدہ نشوونما کے

نمونوں پر غور کریں اور بچوں کی مکمل نشوونما سے واقف ہو جائیں۔ تو گھروں اور اسکولوں میں بچوں کو بے حد فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔ معاشرتی اور جذباتی تحفظ حاصل کرنے میں ہم بچوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔

بچوں کی پرورش کرنے میں بہت سے سوالات جو ہمیں اب پریشان کرتے رہتے ہیں، اب ہمیں علم ہو جائے تو خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے۔ کنڈرگارٹن کے لیے بوتلوں کی ڈوریاں باندھنا اُن کے لیے ایک لاشعوری سی بات ہو جائے گی۔ اسی طرح بہت سے معاشرتی، جذباتی، اور تعلیمی مسائل کچھ عرصہ بعد خود بخود غائب ہو جاتے ہیں، محض اس وجہ سے کہ بچے کو بڑھوتری کے لیئے زیادہ وقت مل جاتا ہے۔

اگر نشوونما کے عمل کو سمجھ لیا جائے تو والدین اور معلّمین کی بہت سی پریشانیاں اور سرگرانیاں رفع ہو سکتی ہیں اس کے سمجھ لینے سے ہمیں اطمینان حاصل ہو سکتا ہے اور بچوں کو خواہ مخواہ آگے بڑھانے کی زحمت سے ہمیں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ بچوں سے جی بہلانے میں بھی اس سے مدد ملے گی اور بچے بھی زیادہ خوش رہ سکیں گے۔

دوسرا باب

ذہنی سانچا کس طرح بروئے کار آتا ہے؟

کبھی آپ نے سُنا کہ کوئی بچہ بیٹھنے سے پہلے ہی چلنے لگا؟ کبھی آپ کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہوئی جو حساب کے آسان سوال حل کرنے سے پہلے ہی اقلیدس کے پیچیدہ مسائل حل کرنے لگا ہو؟ یا آپ کسی ایسے کو جانتے ہیں جو باتیں کرنے سے پہلے ہی پڑھنا سیکھ گیا ہو۔ ایسی باتیں عموماً ہوتی نہیں۔

بچے اگرچہ مختلف رفتاروں سے نشوونما پاتے ہیں۔ ہر چند کہ ایک بچہ دوسرے بچے سے پہلے بہت سے کام کرنا سیکھ جاتا ہے لیکن عملاً سب بچے نشوونما اور عام طرزِ عمل کے ایک ہی سے مدارج

سے گزرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بچے کھڑے ہونے سے پہلے بیٹھنا سیکھتے ہیں، چلنے سے پہلے کھڑے ہونے لگتے ہیں، اور دوڑنے سے پہلے چلنا سیکھتے ہیں، عام طور سے بچے پڑھنے سے پہلے بولنا سیکھتے ہیں اور ہجے کرنے سے پہلے حروف پڑھنے لگتے ہیں۔

نشوونما کے مدارج کوئی بچہ جلدی طے کرتا ہے اور کوئی دیر میں کسی کا دروں ساختہ ٹائم ٹیبل قدرے تیزی سے چلتا ہے اور کسی کا نسبتہً سست رفتاری سے۔ نشوونما کے مدارج بچے چاہے جلدی طے کریں چاہے دیر میں سِن بلوغ کو پہنچنے کے لئے سب کو انفرادی طور پر ایک ہی سی منزلیں طے کرنی ہوتی ہیں، بہرصورت ہر بچے کا ٹائم ٹیبل قدرت بناتی ہے ماں باپ یا معلم کوئی نئی بات بچے کو جلدی سے نہیں سکھا سکتے۔ بچہ جبھی سیکھ سکتا ہے، جب وہ سیکھنے کے لئے تیار ہو۔

ہر بچہ اپنی ہی رفتار سے بڑھتا ہے

ہر بچے کا ٹائم ٹیبل چونکہ مخصوص ہوتا ہے اس لئے "اوسط" بچہ ایک حسابی مفروضہ ہی ہے چھ سال کی عمر والے دس ہزار بچوں کو تولا جا سکتا ہے اور ان کا اوسط وزن ۴۳ پونڈ معلوم کیا جا سکتا ہے، مگر اس اوسط وزن کو ہم سب چھ سال کی عمر والوں کا "صحیح" وزن نہیں کہہ سکتے، بلکہ شاید یہ بھی ممکن ہو کہ دس ہزار میں سے ایک بچے کا وزن بھی واقعی ۴۳ پونڈ نہ نکلے۔ ایک بچے کی نشوونما کی رفتار دوسرے بچے سے مختلف ہوتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہر بچہ وزن میں اوسط سے کم ہو یا زیادہ ہو ۔ جمیلہ جو جلدی بڑھ رہی ہے اپنا وزن بھی جلدی بڑھا رہی ہے ۔ مریم کی بڑھوتری سست ہے اس لئے اس کا وزن بھی کم بڑھ رہا ہے ، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ سب بچے تندرست ہوں اور اُن کی انفرادی رفتارِ نشوونما کے اعتبار سے ان کا وزن صحیح ،، ہو ۔ نشوونما کے مختلف ڈھنگ ہوتے ہیں جو وراثتہً بچوں کو ملتے ہیں ۔ یہ فرق بھی انہی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں اور بچے مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی نشوونما میں ان کی پیروی کریں ۔

یکایک بڑھنا رُک کر بڑھنا اور بڑھوتری کا رُک جانا ۔

بچوں میں جس طرح بڑھوتری کے ڈھنگ مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ایک ہی بچے میں یکایک بڑھنے ، رُک رُک کر بڑھنے اور بڑھوتری کے رُک جانے کے مدارج بھی ہوتے ہیں جمال نے آٹھ اور دس سال کی عمر کے درمیان کچھ زیادہ قد نہیں نکالا ، لیکن اس کے بعد ایک سال ہی میں اس کا قد پانچ انچ بڑھ گیا ۔ اس بہن حلیمہ بہت ہمواری سے بڑھتی رہی اگر ان کے ماں باپ ان کی بڑھوتری میں کسی قسم کا فرق کرنا چاہتے تو ہرگز کامیاب نہ ہوتے ۔

لیکن اگر حلیمہ بیمار پڑ جاتی ، اس کی بھوک سُوکھ جاتی ، اس کی نیند اُڑ جاتی اور ایک مہینے تک اسکول نہ جا سکتی تو اس کا کیا حشر ہوتا ؟ کیا اس کی نشوونما کی عام رفتار بدل جاتی ؟ غالباً بدلتی بچپن میں جو بیماریاں عموماً ہوتی ہیں

اُن سے بڑھوتری کی رفتار کچھ عرصے کے لیے سُست پڑ جاتی ہے۔ لیکن اچھے ہونے کے بعد بچے کی نشوونما کی رفتار بالعموم تیز ہو جاتی ہے اور وہ اُس درجے پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اُسے تندرستی کی حالت میں پہنچ جانا چاہیے تھا اس کے بعد اس کی نشوونما کی رفتار پھر معمول پر آجاتی ہے۔

جیسے بجلی سے چلنے والے انجن ہلکا بھاری ہر قسم کا بوجھ کھینچتے ہیں اور ان کی رفتار میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے پاتا اسی طرح ہمارے جسم بھی طرح طرح کے مطالبات کو گوارا کر لیتے ہیں نشوونما کی رفتار اور ڈھنگ جو ماں کے پیٹ میں قائم ہوتے ہیں انہی کو ہمارے جسم ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے جسم اگرچہ نشوونما کے لیے فطرت کے احکام کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں تاہم ان کی عملی کارکردگی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر کسی بچے کی علالت بہت طویل اور شدید ہو جائے تو اس کی نشوونما اس کی صلاحیت کے مطابق نہیں ہوگی۔ اگر خوراک کی وجہ سے بچے کی نشوونما رکنے والی ہوگی تو بڑھ رکنے سے پہلے قدرت بچے کو مجبور کر دے گی کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو سست کرے۔

بچہ بڑھنا چاہتا ہے

ماں باپ کا کوئی حکم نہیں ہوتا، بچہ خود یہ خود اپنی ٹانگیں چلاتا ہے تاکہ اُن میں نشوونما ہو۔ گھنٹوں وہ اپنے جھنجھنے کو پکڑنے کی مشق کرتا رہے گا۔

بیٹھنے، کھسکنے اور کھڑے ہونے کے لیئے وہ اتنی ہی محنت کرتا ہے، جتنی کسی پیچیدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لیئے معمر آدمی کرتا ہے، بچہ بڑھنا چاہتا ہے اور اپنی شیر خوار گی میں اپنے ماحول سے سوائے آرام اور محبت کے کسی اور چیز کا خواہش مند نہیں ہوتا مثلاً بچہ پیٹ کے چلنا سیکھتا ہے تو اس کے لیئے کوئی سامان درکار نہیں ہوتا اور نہ کسی اُستاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی خاص چیز یا سامان کی ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اُسے کھسکنا سکھائے۔ وہ آپ ہی آپ مشق کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ مشکل کام کو سیکھ جاتا ہے۔

بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے اندر جلد از جلد بڑھنے کی لگن ہوتی ہے اگر ہم یہ محسوس کر لیں کہ بچہ خود اپنا بہترین رہنما ہوتا ہے، اور اپنے غیر معقول مطالبات سے اگر اس کی سیکھنے کی فطری خواہش کو کچل کر نہ رکھ دیں تو وہ بڑی آسانی سے ترقی کرتا رہے گا جیسے جیسے بچہ بچہ تیار ہوتا جائے گا خود بخود پختگی کی طرف یکے بعد دیگرے قدم اُٹھاتا رہے گا۔

یہ معلوم کرنے کے لیئے کئی تجربے کئے گئے ہیں کہ اگر بچے کو نئے نئے کام سکھلائے جائیں تو بچے کی دُردُوں ساختہ رفتارِ کار کو تیز کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جڑواں بچے سب سے اچھا نمونہ ہوتے ہیں۔ سائنس والوں نے تجربہ کے لیئے ۴۶ ہفتے کی عمر کے دو جڑواں بچے لیئے سیڑھیاں چڑھنا ان میں سے ایک کو بھی نہ آتا تھا۔ بچے جس عمر میں

عموماً سیڑھیاں چڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں، اس سے چھ ہفتے پہلے جڑواں بچوں میں سے ایک کو سیڑھیوں سے دور رکھا گیا، اور دوسرے بچے کو سیڑھیوں پر چڑھنے کے لیے ہر ممکن امداد دی گئی، اور جلد از جلد اس میں اس صلاحیت کو بڑھانے کی کوشش کی گئی۔

چھ ہفتے ختم ہونے کے بعد پہلے بچے کو صرف دو ہفتے سیڑھیاں چڑھنے کی تربیت دی گئی۔ چند ہی روز میں یہ بچہ اُتنی ہی اچھی طرح سیڑھیاں چڑھنے لگا جتنی کہ ڈیڑھ مہینے کی تربیت پانے والا بچہ۔

انہی جڑواں بچوں کا دوسرے کاموں میں بھی امتحان لیا گیا، مثلاً چوب پاروں کو مرتب کرنا، الفاظ کی تعداد، اور یادداشت۔ نتائج
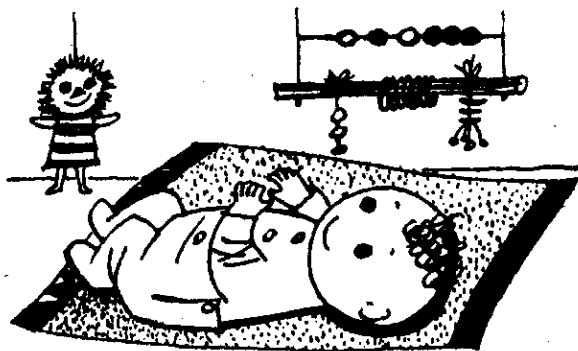
بچے میں جلد از جلد سب کچھ سیکھ جانے کی خواہش ایک فطری جذبہ ہے

یکساں رہے۔ جب ان کی عمر اتنی ہو گئی کہ زبان یاد کرنے لگیں تو دونوں آسانی سے یاد کر لیتے۔ مگر اس عمر سے پہلے ہر قسم کی تربیت اور امداد کے باوجود ایک بچہ دوسرے بچے پہ فوقیت نہ لے جا سکا در اصل جب تک بچے کا جسم اور اعصابی نظام موزوں حد تک پختہ نہ ہو جائے تربیت اور امداد بیکار ثابت ہوتی ہے۔

رفتار بچہ ہی قائم کرتا ہے

بہت سے والدین کو اس بات کا تجربہ ہوا ہو گا کہ بچے کے لئے کوئی زیادہ قیمت کا کھلونا خریدا مثلاً کل پرزوں یا چوبی ٹکڑوں کو ترتیب دے کر مختلف چیزیں بنانے کے متعلق، مگر اس قیمتی کھلونے کے مقابلے میں بچے نے کسی کم قیمت کے کھلونے کو اپنے لیے پسند کر لیا اور عمدہ کھلونے کو نظر انداز کر دیا۔

محمود کی نانی نے محمود کی دوسری سالگرہ پہ ایک بڑا خوبصورت کھلونا بھیجا، جس میں طرح طرح کے جانور تھے۔ محمود کی اماں بکس میں سے ایک ایک جانور باہر نکالتی رہیں اور جب آخری جانور انہوں نے باہر نکالا تو خوش ہو کر بولیں "اے محمود،، نانی اماں نے تمہارے لیے کیسا عمدہ تحفہ بھیجا ہے، دیکھا تم نے؟" مگر محمود میاں کھلونے کے خالی پٹھے کے بکس پہ ناک لگائے رہے کہ اس کا کیا کیا بن سکتا ہے۔ کبھی اسے کھولا، کبھی بند کیا، کبھی اسے دھکیلا اور کبھی کھینچا اور کبھی خود اس میں چڑھ کر بیٹھ

گئے۔ تین دن تک وہ اسی خالی ڈبے سے کھیلتے رہے کبھی اس کی گاڑی بنائی جاتی، کبھی ریل، کبھی گھر اور کبھی پلنگ۔ محمود کی اماں دل ہی دل میں ناراض ہوتی رہیں کہ دیکھو نانی اماں نے تو اتنا اچھا کھلونا اسے بھیجا اور یہ اسے چھوڑ کر خالی ڈبے کو لیے پھر رہا ہے! انہوں نے یہ کیا کہ جب محمود سو گیا تو ڈبا چھپا دیا۔ جب جاگنے پر محمود کو معلوم ہوا کہ ڈبا غائب ہو گیا تو رونے اور چیخنے لگا۔ نانی اماں کے بھیجے ہوئے کھلونے کی طرف اس نے بھی توجہ نہ کی۔ دراصل ابھی محمود کی عمر اتنی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پیچیدہ کھلونوں سے رغبت کرنے لگے۔

طرح طرح کے کام کیسے اور کب سیکھے جائیں؟ بچہ خود ہی اس کا فیصلہ کرتا ہے سیکھنے کی رفتار خود ہی قائم کرتا ہے۔ اگر ہمارے بچے ہی بڑھ رہے ہوں تو ہم ان کے لیے مواقع مہیا کر سکتے ہیں کہ جلد از جلد اُن کی نشوونما ہو۔ اگر پیچیدہ کھلونوں پر وہ قابو پا سکتے ہوں تو انہیں ہم پیچیدہ کھلونے دے سکتے ہیں انہیں ایسی کتابیں دے سکتے ہیں جن کی انہیں ضرورت ہو، یا ان کے سوالات کے ہم جواب دے سکتے ہیں۔ اگر ہمارے بچے ذرا دیر میں بڑھ رہے ہوں تو ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ہم ہر ممکن امداد دے سکتے ہیں، لیکن ہمیں یہ توقع تو رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی پیدائشی صلاحیت سے بڑھ کر کوئی کام ہماری مدد سے کر سکیں گے۔

ماحول بچوں کی نشوونما پر اثر انداز ہوتا ہے

ہم بتا چکے ہیں کہ بچے کی فطری رفتارِ نشوونما کو امداد و تربیت سے بڑھایا نہیں جا سکتا لیکن ناموزوں ماحول بچے کی فطری قوتِ نمو کو سست کر سکتا ہے۔ اگر ماحول اتنا شدید ہو کہ بچے کو غذا بالکل نہ ملے تو وہ بھوکا مر جائے گا، لیکن بچہ ذہنی، معاشرتی اور جذباتی فاقہ زدگی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر کلیم کو لیجیے، اس نے چھ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا کچھ دنوں تک وہ ترقی کرتا رہا۔ پھر اس کی رفتار رک گئی۔ دو سال گزر گئے اور اس کی "تعلیمی عمر" چھ سال ہی رہی۔ ذہانت کے امتحانوں سے معلوم ہوا کہ اس کی ذہانت عام معیار سے قدرے زیادہ تھی اس پر بھی اس نے پڑھنے میں کوئی ترقی نہ کی۔

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جسمانی طور پر اس کی نشوونما صحیح نہیں ہو رہی تھی۔ جب وہ چھ سال کا ہوا تو اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کی مناسب خبرگیری کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اس کے معلم کو معلوم ہوا کہ اسے اچھا کھانا نہیں مل رہا ہے اس کے علاوہ دن کو کھانا کھانے کے لیے اُسے روزانہ بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑتا تھا اور اس میں اس کی بہت سی قوت زائل ہو جاتی تھی۔

اسکول کے نفسیاتی ماہر نے اس بچے کے باپ سے کہہ سن کر

نے بچے کی نگہداشت بہتر طریقے پر کرنے کا انتظام کیا۔ کلیم کو بہتر کھانا ملنے لگا اور دوپہر کے کھانے کے لئے گھر کا لمبا راستہ طے کرنے کی اُسے نہ تھی کیونکہ کھانا اُسے اسکول ہی میں ملنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بہتر ہونے لگی اور ماں کے مرنے کا غم بھی کم ہوتا چلا گیا۔ اس کی بڑھوتری کی رفتار کچھ دنوں میں تیز ہو گئی۔ نشوونما کے انفرادی گینڈے کے مطابق اس کی پڑھنے کی قابلیت بھی بڑھتی گئی یہاں تک کہ اپنی عمر کے بچوں کی اوسط قابلیت کے مطابق کلیم کی قابلیت بھی ہو گئی۔

کلیم کی مثال سے ظاہر ہوا کہ جو بچہ بڑھوتری کے دوسرے میدانوں مثلاً وزن یا قامت، میں پیچھے رہ جاتا ہے اسکول میں بھی اچھے نمبر حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسکول میں اچھی ترقی کرنا بھی بچے کی پوری نشوونما ہی کا ایک جزو ہوتا ہے۔

پیمائش کے بہتر پیمانے

نشوونما اتنی وسیع اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ ماہروں کو اس کے مختلف پہلو ناپنے کے لیۓ ایک پیمانے کی ضرورت ہوتی ہے روز و شب اور ماہ و سال سے عمر کو شمار کرنے کے علاوہ ماہروں نے سات اور "عمریں" متعین کی ہیں جن سے بچے کی نشوونما کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مثال کی طور پر چھ سال کے بچے کا اوسط وزن ۴۳ پونڈ ہوتا ہے۔ لہٰذا ۴۳ پونڈ کو بچے کی "وزنی عمر" کہا جا سکتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ "وزنی عمر" کا اندازہ کسی حد تک بچے

کی شب و روز کی عمر سے لگایا جا سکتا ہے (مثلاً ایک سال کی عمر والے کا وزن ۵۰ پونڈ تو نہیں ہو سکتا ، صرف "وزنی عمر" ہی کا حساب لگایا جا سکتا ہے صحیح اندازہ تول سے ہو سکتا ہے۔ باقی چھ عمروں کی ناپ

ان بچوں کی عمر دس سال ہے لیکن ان کی بالیدگی کی عمر کا اوسط ۸ سے ۱۲ تک ہے

تول بھی کی جا سکتی ہے ساتوں عمریں یہ ہیں :-

- ★ وزنی عمر (پونڈ میں وزن)
- ★ قامتی عمر (انچوں میں بلندی)
- ★ ذہنی عمر (ذہانت کے انفرادی امتحانات کا نتیجہ)
- ★ گرفتی عمر (گرفت کی قوت بتانے والی مشین سے)
- ★ دندانی عمر (دانتوں کی تعداد سے)
- ★ دستی عمر (ایکس ریز کی مشین سے ہاتھ اور کلائی کی ہڈیوں کا معائنہ)
- ★ تعلیمی عمر (سیکھے ہوئے الفاظ کی تعداد چھپی ہوئی ہدایات کو سمجھنے کی استعداد اور مضمون کے ایک پارہ کے معنی سمجھنے کی قابلیت۔

بڑھوتری کے سانچوں میں اتحاد

کسی بچے کی ساتویں عمروں کو ملا جلا کر جب سائنس دان اس کی بڑھوتری کی پیمائش کرتے ہیں تو بڑھوتری کے سانچے میں ایک طرح کا اتحاد نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی نشوونما ایک ہی خلیے سے ہوتی ہے۔

بڑھوتری کے سانچے میں جو اتحاد یا یکسانیت پائی جاتی ہے اس کی مثال جلد پختہ ہونے والی بچی سائرہ ہے۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو ہائی اسکول کی اوسط لڑکیوں کی طرح پڑھ سکتی تھی اور سیکھ سکتی تھی جسمانی طور پر وہ اونچے قد کی اور قوی الجثہ تھی۔ اس کی ذہنی عمر تقریباً ۱۵ سال تھی۔ اس کی قامتی عمر اور دستی عمر ۱۴ سال کی عمر والوں کے برابر تھی نفسیات کے ماہروں نے معلوم کیا کہ سائرہ کی جذباتی اور معاشرتی نمو بھی بڑھی ہوئی تھی۔

سائرہ کی مثال ایک نمونے کی مثال ہے۔ بچوں میں عموماً یہ نہیں ہوتا کہ کلاس کے کسی ایک کام میں تو سب سے آگے ہوں اور باقی سب کاموں میں سب سے پیچھے۔

نشوونما سانچے کی یکسانیت کو عملاً یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ بڑھوتری کے ساتوں پیمانوں کا ایک نقشہ بنا لیا جائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خطوط یکساں بڑھتے نظر دکھائی دیں مگر رہیں گے ایک دوسرے کے قریب ہی، کلیے کے استثنا بھی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض بچوں کی ذہنی عمر بہت

زیادہ ہو اور دوسرے اجزا نسبتاً کم ہوں۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ عمر کے پیش نظر بچہ نہ زیادہ لمبا یا نہ زیادہ بھاری ہو، اور دوسری خصوصیات میں اپنی ٹولی والوں سے کمتر ہو۔

بہر حال عمومی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جلد پختہ ہونے والا بچہ ساتوں اعتبار سے، یعنی ذہنی اعتبار سے لے کر دستی گرفت کے اعتبار تک جلد بڑھے گا اور دیر میں پختہ ہونے والا بچہ ساتوں معیاروں سے دیر میں بڑھے گا۔

تیسرا باب

بچے جسمانی طور پر کیسے بڑھتے ہیں

ہم بتا چکے ہیں کہ بچے کی نشو و نما کے تمام رقبوں ۔ جسمانی، ذہنی، معاشرتی، اور جذباتی ۔ میں ربط ہوتا ہے اور جب ہم کہتے ہیں بچے کی "بڑھوتری"، تو ان تمام رقبوں میں بچے کی کلّی نشو و نما مراد ہوتی ہے اس مختصر سی کتاب میں ہم بڑھوتری کے ہر رقبے کا الگ الگ جائزہ لیں گے ۔ جائزے کی ابتدا سب سے نمایاں رقبے سے کریں گے یعنی جسمانی نشو و نما سے ۔

بچے کے پیٹ میں پڑنے سے بچے کے پورے جوان ہونے

تک نشوونما کے جتنے مدارج ہوتے ہیں، انھیں ہم نے خاص خاص عرصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ا سے ۶ سال، ۶ سے ۱۰ سال، ۱۰ سے ۱۲ سال۔ بلوغ یا وہ عمر جب بچہ جسمانی طور پر تولید کے قابل ہو جاتا ہے، اور آغازِ شباب یا وہ زمانہ جس میں بچے بلوغ سے بڑھ کر جوانی میں داخل ہوتا ہے۔ یقیناً قدرت نے نشوونما کی اتنی واضح حدود و قیود مقرر نہیں کی ہیں، لیکن اس قسم کی حدود قائم کر لینے سے ہمیں بچوں کی نشوونما کے سمجھنے میں مدد ملے گی، اور ہم یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ ان مختلف مدارج نمو میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

ابتدا میں!

ہر بچہ ایک بالکل نیا اور مختلف فرد ہوتا ہے جس کا آغاز ماں کے بیضے اور باپ کے جرمِ تولید کے اتحاد سے ہوتا ہے۔ پیٹ میں پڑنے سے لے کر پیدا ہونے تک بچے کی نشوونما خود بخود ہوتی رہتی ہے جسمانی طور پر نازائیدہ بچہ شکمِ مادر میں خوب محفوظ ہوتا ہے کم خوراکی سے بھی محفوظ ہوتا ہے کیونکہ قدرت اس کا انتظام کرتی ہے کہ اُسے پوری خوراک ملتی رہے، چاہے اس خوراک کے مہیا کرنے میں ماں کی اپنی ضروریات نمو میں کمی واقع ہو جائے۔

معمولاً نازائیدہ بچہ نشوونما کے اُس سانچے کو پورا کرتا ہے جو پیٹ میں پڑتے وقت متعین ہو جاتا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہوتا،

اور اگرچہ ماں کی عمدہ صحت سے پوری طرح نشوونما حاصل کرنے میں غالباً اُسے مدد ملتی ہے تاہم شکمِ مادر میں وہ جس طرح بڑھتا رہتا ہے اس میں ہم کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکتے۔

پہلا سال

بچے کی زندگی کے ابتدائی ۳۶۵ دنوں میں بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ کہ جسمانی لحاظ سے بچہ خوب بڑھتا ہے۔ شیر خوارگی سے شباب تک بڑھوتری کی رفتار شکمِ مادر میں بڑھوتری کی رفتار سے کہیں کم ہوتی ہے، لیکن شیر خوارگی اور طفولیت میں رفتارِ نمو شباب تک کی بڑھوتری کی رفتار سے تیز ہوتی ہے۔

اوسط بچے کی زندگی کے پہلے سال کے لئے مختصراً چند باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا وزن ۷½ پونڈ ہوتا ہے پہلی سالگرہ پر اس کا وزن اس سے تین گنا ہو سکتا ہے۔ پیدائش کے وقت اس کا قد ۲۰ انچ کا ہوتا ہے۔ سال بھر بعد ۳۰ انچ ہو سکتا ہے اس کا پہلا دانت ۶ یا ۷ مہینے کی عمر میں نکل سکتا ہے۔ اگرچہ پہلا دانت نکالنے میں فرداً فرداً بہت فرق ہو سکتا ہے۔

اس کا جسمانی تناسب بھی بدلتا جاتا ہے پہلے سال کے اختتام پر ہاتھ پاؤں کے مقابلے میں اس کا سر کم بڑا نظر آئے گا۔ اس کے بعد

نسبتہً زیادہ تیزی سے سر بھی بڑھنے لگے گا۔

اس کے چھونے، چکھنے، اور سونگھنے کے حواس اُسے اپنے آس پاس کی دُنیا کو سمجھنے میں مدد دینے لگتے ہیں۔ اس کے پٹھے مضبوط ہوتے جاتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے چیزوں کو پکڑنے لگتا ہے لاتیں چلانے لگتا ہے اور کھسکنے لگتا ہے، اور آنکھیں جما کر دیکھنے لگتا ہے۔ سال ختم ہوتے ہوتے اپنی جسمانی نشو و نما کے باعث جو کچھ دیکھتا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ کو پہچاننے لگتا ہے، اور جو کچھ سُنتا ہے اس میں سے کچھ کو سمجھنے بھی لگتا ہے۔

زندگی کے اس پہلے سال کا مطالعہ ڈاکٹر بہت غور سے کر رہے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ اس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں کہ بچے کی اپنی رفتار اور نمو کے سانچے ہی ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ بچوں کو غذا کیسی اور کب دی جائے۔ اس کی طہارت کس طرح کی جائے اور سونے کی کیسی عادت ڈالی جائے؟

ہمیں معلوم ہے کہ ذرا بڑے ہونے کے بعد بچوں بچوں میں بہت فرق ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں اس کا بھی یقین ہو گیا کہ شیر خوارگی میں بھی ان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بہت سے ماہر غذائیات مشورہ دیتے ہیں کہ بچے کو وہی غذا کھلانی پلانی چاہیے، جسے وہ سب سے زیادہ پسند کرے، کیونکہ بچے کی ضرورت کی رہنمائی اس کی بھوک یا رغبت ہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اس بات کا مشورہ بھی دیتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو اُسی طرح غذا دیں جیسے ایامِ جہالت میں مائیں اپنے بچوں کو کھلاتی پلاتی تھیں یعنی جب وہ

غذا کے لیئے رونے لگے۔ وقت اور ساعت کی پابندی اتنی مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ چونکہ بچوں میں بہت فرق ہوتا ہے، اس لیئے سب یہ نہیں چاہیں گے کہ ٹھیک مقررہ وقتوں پر انہیں غذا دی جائے۔ رفتہ رفتہ ان کے اندرونی انضباطِ اوقات قائم ہو جائیں گے اور انفرادی ضرورتوں کے مطابق ان کے موزوں غذا کی نقشے بن جائیں گے۔

ایک سے ۶ سال تک

ایک سے چھ سال کی عمر کے درمیان بچے کی کلی نشوونما میں بعض بڑی اہم تبدیلیاں ہوتی میں ایک سال کا ہوتے ہوتے وہ کھینچ تان کر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ چھ سال کی عمر کو پہنچ کر وہ چلتا ہے بولتا ہے، اپنی بہت سی ضرورتوں کو خود پورا کرنے لگتا ہے، اور گھر سے علیحدہ رہ کر اسکول میں کئی کئی گھنٹے گزارنے لگتا ہے۔

ابتدائی بچپن میں سب بچے تیزی سے بڑھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بڑھنے اور سیکھنے کی رفتار بچوں میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض بچے اپنی پہلی سالگرہ کے بعد ہی چلنا سیکھ جاتے ہیں، اور بعض ڈیڑھ سال سے پہلے چلنا نہیں سیکھتے۔

اسی عرصے میں طہارت کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ بالکل چلنے کی طرح اسے آپ جلدی سے نہیں سکھا سکتے۔ جب تک بچہ جسمانی، ذہنی اور اعصابی طور پر تیار نہ ہو جائے ماں کو اس کے اوقات کی پابندی کرنی چاہیئے۔

۲ سے ۶ سال کی عمر تک بڑے پٹھے تیزی سے بڑھتے ہیں اور بچے کو ایسے مواقع کی ضرورت ہوتی ہے کہ خوب بھاگے، چڑھے، پھسلے، اور کودے تاکہ ان پٹھوں پر قابو پائے اور پٹھوں میں ربط پیدا کرے اس زمانے میں اس کی حرکی ہنرمندیاں ناہمواری سے ترقی کرتی ہیں اس لیے بعض ہنرمندیوں کے کام وہ عمدگی سے کرے گا اور بعض خرابی کے ساتھ۔

۶ سے ۱۰ سال تک

طفولیت کے درمیان یعنی ۶ سے ۱۰ سال تک بچے کے جسم کے کل اعضا بڑھتے رہتے ہیں لیکن بڑھنے کی رفتار گھٹ جاتی ہے جب بچہ اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں ہوتا ہے تو اس کی بڑھوتری
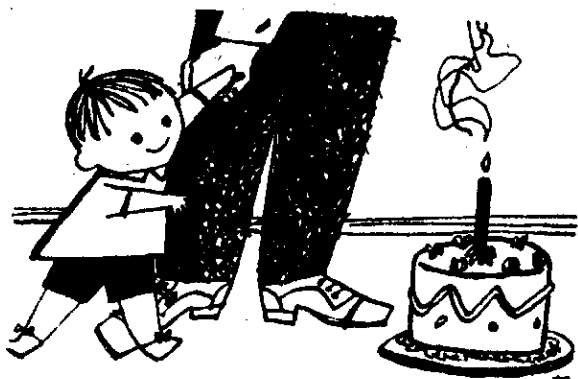
(بعض بچے ایک سال کی عمر میں چلنے لگتے ہیں، بعض ڈیڑھ سال میں)

اپنی جوانی کے قدو قامت کی ۴۲ فی صد ہو سکتی ہے۔ دماغ اور اعصابی نظام ۹۰ فی صد، اور نظامِ تولید کی ۱۹ فی صد۔

اس عمر میں بچوں کے دودھ کے دانت ٹوٹنے لگتے ہیں ابتدائی جماعتوں میں ایسے کھونڈرے بچے" بہت دکھائی دیتے ہیں۔

اس عرصہ میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے اعضائے جنسی جسم کے دوسرے اعضا کے مقابلے میں سست رفتاری سے بڑھتے ہیں۔ لیکن جنسی احساسات اور جذبات پیدا ہونے لگتے" ہیں اور جلق کی علّت بھی لاحق ہونے لگتی ہے۔ پٹھوں پر قابو اب بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتا اور نہ پٹھوں میں پورا ربط ہوتا ہے، لیکن ہاتھوں میں اتنی پھرتی آجاتی اور ہاتھ آنکھ کا ربط اس حد تک ہو جاتا ہے کہ بچہ اپنی انگلیوں سے لکھنے، تصویر بنانے، سینے پرونے اور کوئی ساز بجانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ چھوٹے پٹھوں کے مقابلے میں بڑے پٹھوں پر اسے زیادہ قابو حاصل ہو جاتا ہے، مثلاً ران اور ٹانگ اور بازو کے پٹھوں پر۔

"وسطی عمر" کے بچے کو نسبتہً غذا اور آرام کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تاکہ بڑھتی ہوئی چستی اور اسکول کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس کے بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے مواقع بھی حاصل ہونے چاہئیں تاکہ اسکول کے کاموں میں لگے رہنے کی وجہ سے اس کی جو قوت گھٹ کر رہ جاتی ہے اس کا اخراج کھیلوں میں کر سکے۔

۱۰ سے ۱۲ سال تک

عہدِ طفولیت کے آخری حصے میں جنسی خصوصیات میں تیزی سے تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں میں وزن، ہڈیوں کی لمبائی اور پٹھوں کے پھیلنے میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔

دونوں صنفوں میں اعضائے جنسی کے گرد رُواں آنے لگتا ہے یہ ایک علامت ہے ابتدائے بلوغ کی۔ شروع میں روئیں کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ بلوغ کے دوسرے درجے میں رُواں کالے بالوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور تیسرے درجے میں یہ بال بل کھانے لگتے ہیں۔ اعضائے جنسی کے اطراف یہ بال عموماً پہلے ظاہر ہوتے ہیں ان کے بعد بغلوں میں بال نکلتے ہیں۔

لڑکیوں میں اِن بالوں کے ظاہر ہونے سے پہلے چند اور تبدیلیاں نظر آنے لگتی ہیں کولہے مدّور ہونے لگتے ہیں، اور ۱۱ سال کے لگ بھگ سینہ اُبھرنے لگتا ہے۔ بلوغ کے آخری درجوں میں حیض آنا شروع ہو جاتا ہے ایسا اُس وقت بھی ہوتا ہے جب لڑکی اپنا پورا قد نکال لیتی ہے ٹھنڈے ملکوں میں یہ کیفیت ۱۲ سال کی عمر میں ہوتی ہے، لیکن ۱۰ سے ۱۶ سال کی عمر کے درمیان کسی وقت بھی آغازِ حیض ہو سکتا ہے، اور اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ جنسی طور پر لڑکیاں، لڑکوں سے کم و بیش ایک سال پہلے بالغ ہو جاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آغازِ حیض سے قبل ہی لڑکی کا سینہ پوری نشوونما پائے۔

بلوغ اور عنفوانِ شباب۔ بڑی بڑی تبدیلیوں کا زمانہ

دراصل بلوغ بچوں کی زندگی میں مخصوص زمانے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ وقت کا ایک خاص نقطہ ہوتا ہے، جب لڑکیاں یا لڑکے جنسی پختگی حاصل کرتے ہیں اور تولید کے قابل ہو جاتے ہیں، لیکن ہم ۱۰ سے ۱۶ سال کے درمیانی زمانے ہی کو زمانۂ بلوغ سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اسی میں بلوغ کا نقطۂ وقت آجاتا ہے۔ (بلوغ کے ساتھ جو جسمانی تبدیلیاں آتی ہیں ۹ سال کی عمر سے پہلے بھی شروع ہو سکتی ہیں اور ۱۶ سال کے بعد بھی)، اِس کے برعکس عنفوانِ شباب کا زمانہ ہوتا ہے جو بلوغ اور جوانی کے درمیانی زمانہ ہوتا ہے۔

بلند قد والے بچے پست قد والے بچوں سے پہلے سن بلوغ کو پہنچتے ہیں۔ اِس عرصے میں اور عنفوانِ شباب کے زمانے میں بھی نمو کی رفتار اگرچہ گھٹ جاتی ہے، تاہم وزن بڑھتا رہتا ہے۔ چربی کے بڑھنے سے نہیں بلکہ ہڈیوں کے بڑھنے سے۔ ۱۶ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے لڑکیاں اپنا پورا قد نکال لیتی ہیں، لیکن لڑکوں کا قد ۱۸۔ ۱۹ سال کی عمر تک بڑھتا رہتا ہے۔ معدہ بڑا اور لمبا ہوتا جاتا ہے، بھوک بڑھ جاتی ہے اور طرح طرح کے کھانوں کو جی چاہتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے، جب مہاسے اور پھنسیاں نکلنے لگتی ہیں اس وقت غذا اور عام جسمانی احتیاط کا خیال رکھنا چاہیئے۔

اس زمانے میں نمو کی رفتار تیز بھی ہو سکتی ہے، جس کا اظہار سستی اور کاہلی کی شکل میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ بھاگ دوڑ کے کھیلوں میں بعض لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے لمبے ہاتھ پیروں کا ضرورت سے زیادہ احساس ہونے لگتا ہے اور کھیلوں میں شریک ہونے سے جی چرانے لگتے ہیں، لیکن جب عنفوانِ شباب میں اعضائی ربط بہتر ہوجاتا ہے تو یہ کیفیت خود بخود دور ہوجاتی ہے۔

قوت، دماغ، یا دونوں

بہت سے باپ اپنے شیرخوار بچے کو دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ دن کب آئے گا جب میرا بچہ فٹ بال ٹیم کا کھلاڑی بنے گا، یا کرکٹ کھیلنے میں نام پیدا کرے گا۔ بچے کے بلوغ یا عنفوانِ شباب کے زمانے
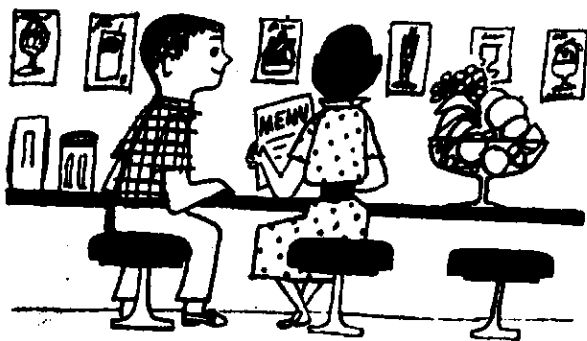
سنِ بلوغ کو پہنچنے والے بچوں کو طرح طرح کے کھانوں کا شوق ہوتا ہے

میں باپ اس خواب کو حقیقت بن جانے کی آس لگاتا ہے۔

یہ سوچ کر باپ گیند بلا، فٹ بال، اور کھیل کے کپڑے وغیرہ بچے کے لیے لاتا اور گھر کے آگے کے میدان میں اس کے کھیلنے کا انتظام کرتا ہے، لیکن بچے کا دروں ساختہ سانچا ان تمام فراہمیوں اور آسانیوں کو قبول نہیں کرتا اور اس کے وزن میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا کہ فٹ بال کھیلنے کے لائق ہو جائے یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کے پٹھوں اور اعضا میں اتنا ربط پیدا نہیں ہوتا کہ کہ ایک اچھا کھلاڑی بن جائے۔

اس کے برعکس مثلاً تیرنے کے لیے جہاں صلاحیت اور نمو کے سانچے کی مناسبت درکار ہے وہاں مشق کرنے اور ہدایت پانے کے مواقع بھی بچے کو ملتے رہنے چاہئیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچہ ستار بجانے یا سائنس کے معمل میں اپنا خالی وقت گزارنے کو ترجیح دیتا ہو۔ اگرچہ ورزشی کھیلوں سے بچے کی جسمانی اور معاشرتی نشوونما میں اہم اضافہ ممکن ہے تاہم باپ کو چاہیئے کہ بچے کی رہنمائی اس کی اپنی نشوونما کے سانچے پر اور انفرادی ضروریات پر چھوڑے ورزشی کھیلوں میں بچوں کی شرکت پر اگرچہ بہت زور دیا جاتا ہے پھر بھی اعلیٰ درجہ کا کھلاڑی بنے بغیر بچہ اپنی جسمانی نشوونما کے لئے کافی ورزش کر لیتا ہے کارآمد اور مسرور زندگی کے لیے عمدہ کھلاڑی ہونا ضروری نہیں ہے۔

دیگر مسائل۔ سنِ بلوغ میں بچوں میں جسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن سے

بعض دوسرے بڑے مسائل ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کے ذہن اور جذبات دونوں کو متاثر کرتے ہیں۔ تیز رفتار بڑھوتری سے جو زبردست جسمانی، ذہنی، معاشرتی اور جذباتی ہیجان بچوں میں پیدا ہو جاتا ہے، بڑے عموماً اس کا لحاظ نہیں رکھتے۔ جوان ہونے والے بچے کبھی کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، کبھی پابندیوں پہ بگڑ کھڑے ہوتے ہیں، اور کبھی اپنے والدین سے سرکشی کر بیٹھتے ہیں۔ اس نوع کا طرزِ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ بالغ ہونے والا بچہ "خودسر" ہو گیا یا وہ احسان فراموش" بن گیا یا اپنے والدین کو ناموزوں سمجھنے لگا اس کی وجہ عموماً جسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ خصوصاً دروں افرازی غدود، ان بیہودگیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ہم نے عنوانِ شباب پر نمو کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے، کیونکہ بچے کی عمر کا یہ زمانہ والدین کے لیے خاصا پریشانی اور زحمت کا زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن بچے کی پوری نشوونما کی یہ صرف ایک منزل ہوتی ہے اگر ہم بچے کی پوری نشوونما کے سانچے کو سمجھ لیں تو بالغ ہونے والے بچے کی ناہموار بڑھوتری کا جواز ہمیں دکھائی دینے لگے گا۔

چوتھا باب

بچوں کی ذہنی نشوونما کیسے ہوتی ہے

ابتدائی سال

اکثر مائیں یہ سمجھتی ہیں کہ بچہ ابتدائی جماعت میں داخل ہوتا ہے تو اُسی وقت سے ذوق وشوق کے ساتھ سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ قمر کی اماں نے جب اسکول میں اُسے داخل کیا تو اچھے اچھے کپڑے پہنائے، نئی ٹوپی اور جوتی پہنائی، اور سمجھ بیٹھیں کہ بچے نے آج سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اِس میں شک نہیں کہ تختی اور قلم لے کر قمر پڑھنے کے لیے تیار ہو گیا، لیکن اِس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قمر کی ذہنی نشوونما پانچ سال کی عمر میں شروع ہوئی۔ اس کا آغاز تو اس کے پیدا ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد ہو گیا تھا۔

بچہ ذہنی طور پر پڑھنے کا بھی اسی قدر خواہشمند ہوتا ہے۔ اعصابی نظام میں صلاحیت پیدا ہو جانے کے بعد۔ جتنا کہ نئے پٹھوں کے تیار ہونے کے بعد ان کو بروئے کار لانے کا۔ ادھر اُدھر سے بڑوں کی عجیب اور حوصلہ افزا آوازیں سُن کر بچہ ان پر عمل کرنا چاہتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ بچہ سیکھنا چاہتا ہے، یا اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کر کے اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونا چاہتا ہے، اگر یہ تبدیلی بچہ اُسی وقت کر سکتا ہے، جب اس کی ذاتی رفتارِ نمو اُسے اس کی اجازت دے۔ خلقی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانے کا دارومدار بڑی حد تک بچے کے ماحول کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اُن تجربات پر جو اُسے حاصل ہوتے رہتے ہیں اور اُن مواقع پر، جن سے وہ دوچار ہوتا رہتا ہے۔

سیکھنا اور ذہانت

سیکھنے میں حاصل کیا ہوا تجربہ شامل ہوتا ہے۔ تجربے سے بچے کو معلوم ہوتا ہے کہ ماں نعمت خانہ میں کھانے کی چیزیں رکھتی ہے وہ کھسک کھسک کر نعمت خانہ تک پہنچنا سیکھتا ہے اور یہ بھی سیکھ لیتا ہے کہ نعمت خانے کے پٹوں کو کیسے کھینچ کر کھولا جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو ہاتھ لگاتا ہے یا چھوٹی چیزوں کو اپنے منہ میں ڈال لیتا ہے اس طرح وہ چیزوں کے بارے میں مسلسل معلومات حاصل کرتا رہتا ہے، اُسے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ سخت کیا ہوتا ہے اور نرم کیا ہوتا ہے، میٹھا کیا ہوتا ہے اور کڑوا کیا ہوتا ہے، برف ٹھنڈی

ہوتی ہے اور آگ گرم۔

اِس کے برعکس تجربہ حاصل کرنے کی صلاحیت یا گنجائش کو ذہانت کہا جاتا ہے، یعنی سیکھنے کی صلاحیت۔ ذہانت جتنی زیادہ ہو گی بچہ اتنی جلدی تجربے سے سیکھے گا، اور غالباً بہ نسبت کم ذہن بچے کے ذہین بچہ اپنے تجربے سے زیادہ سیکھے گا، کیونکہ بچوں میں جیسے جسمانی صلاحیتوں میں بہت فرق ہوتا ہے اُسی طرح نئی نئی باتیں سیکھنے، پچھلے تجربوں کو یاد رکھنے اور ان سے فائدہ اُٹھانے، اور نئے نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیتوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔

بچوں کی ذہانت کی قسموں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ پچھلے زمانے میں نفسیات کے ماہر صرف اس بات پر غور کرتے تھے کہ بچے میں کتنی عام یا کل ذہانت موجود ہے، لیکن بعد میں یہ حقیقت واضح ہوئی کہ افراد میں نہ صرف ذہانت کی کمی یا زیادتی ہوتی ہے۔ بلکہ افراد میں ذہانت بھی مختلف اقسام کی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر نعیمہ زبانی فہم (الفاظ میں پیش کیے ہوئے تصورات کی فہم) سلمیٰ سے زیادہ رکھتی ہے لیکن اشیاء اور گنجائش کے تعلق میں سلمیٰ کی فہم زیادہ ہے۔ نعیمہ کو انگریزی لکھنے پڑھنے میں لطف آتا ہے سلمیٰ کو گھر کا آرائشی سامان سجانے اور اسکول کے رسالے کو ترتیب دینے میں مزا آتا ہے۔

بدر حساب میں بہت تیز ہے۔ ضرب، تقسیم، جمع، نفی کا ادھر سوال

موجودہ ذہنی امتحانوں کی صحت پر اس سے بھی اثر پڑ سکتا ہے کہ بچے مختلف معاشرتی پس منظروں کے ہوں۔ حال میں بہت تحقیق ایسے امتحان وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایسے ذہنی امتحان وضع کئے جائیں جن پر معاشرتی پس منظر کا کوئی اثر نہ پڑے۔

ان اجزا کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ایسے سائنسی بنیاد والے امتحان وضع کئے جا چکے ہیں جن سے بچے کی ذہنی قابلیت کا خاصا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آج کل ذہنی امتحان کے دو طریقے عام طور سے استعمال کئے جاتے ہیں ایک طریقے سے عام ذہانت کی پیمائش کی جا سکتی ہے اور ذہنی عمر اور حقیقی عمر کے تعلق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس اندازہ یا نتیجے کو ذہنی حاصل کہا جاتا ہے۔ دوسرے طریقے سے ذہنی قابلیتوں کی مختلف قسموں کی پیمائش کی جاتی ہے اِس سے عام ذہانت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے اور بچے کی کمزوریوں اور قوتوں کا پتا بھی چل جاتا ہے۔

زمانہ حال تک ذہنی حاصل کو مستقل اور نہ بدلنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اکثر ماہرین نفسیات اب بھی یہی سمجھتے ہیں، لیکن اب ایسی شہادتیں موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی نشوونما مقررہ اور یکساں رفتار سے نہیں ہوتی، بلکہ بڑھوتری کے کھلتے ہوئے سانچے میں ہیجانی اور سکونی وقفے آتے رہتے ہیں۔

نشوونما کے دوسرے اجزا کی طرح ذہانت بھی بچے کی وراثت اور

ماحول کے باہمی اثر و تاثر کے نتیجے کے طور پر نمو پاتی ہے ، اور اسے پوری طرح بڑھانے کے لیے ماحول سے مدد ملتی رہنی چاہیئے ۔ نشو و نما کی رفتار کی دوسری اقسام کی طرح اس کی نشو و نما کی رفتار بھی انفرادی نموئی سانچے کے مطابق بدلتی رہتی ہے ۔
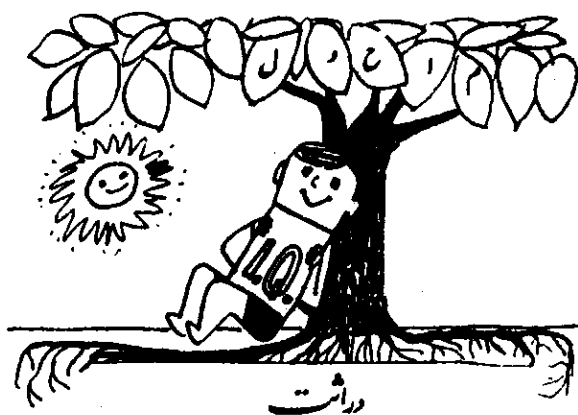
وراثت اور ماحول دونوں بچے کی ذہانت کی نشو و نما میں حصّہ لیتے ہیں

سیکھنے کا آغاز کیسے ہوتا ہے

ہم بتا چکے ہیں کہ بچے کے سیکھنے کے تجربات کی کامیابی کا دارو مدار بڑی حد

تک اس کی ذہانت یا سیکھنے کی قابلیت پر ہوتا ہے۔ لیکن سیکھنے میں اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی، جب تک کہ شیر خوار بچہ اپنے دیکھنے، چھُونے سُننے، سونگھنے، اور چکھنے کے ابتدائی تجربات کا کوئی مفہوم نہ سمجھنے لگے۔ دو تین مہینے کا بچہ عموماً اپنے تجربات کا مطلب نکالنے لگتا ہے اس کے سیکھنے میں اُس وقت اضافہ ہوتا ہے، جب وہ چیزوں یا باتوں کو ذرا زیادہ سمجھنے لگتا ہے، اپنی توجہ کو چیزوں یا واقعات پر جمانے لگتا ہے۔ اور دو یا دو سے زیادہ اشیا کے باہمی ربط کو دیکھنے لگتا ہے۔

زندگی کے ابتدائی چھ یا آٹھ مہینوں میں بچے کی ذہنی نشوونما اپنے پٹھوں کے استعمال سیکھنے تک محدود رہتی ہے یا اپنے حواسِ خمسہ کے تجربات کی فہم میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ دماغ کے نچلے حصے کے اور حرام مغز کے تابع اس کا طرزِ عمل ہوتا ہے۔ عمر جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے، دماغ کے اوپری حصے کے خلیے نشوونما پاتے جاتے ہیں اور مجرّد طور پر سوچنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خاص خاص تجربات سے بچہ عام نتائج نکالنے لگتا ہے اور اپنے تصورات قائم کرنے لگتا ہے۔

زمانۂ شیر خوارگی اور ابتدائی عہدِ طفولیت میں ذہنی نشوونما خاص تیزی سے ہوتی ہے اسکول کے ابتدائی زمانے میں قائم ہونے لگتی ہے اور سنِ بلوغ کو پہنچتے پہنچتے رفتار گھٹنے لگتی ہے، اور بیس[2] سال کی عمر میں رُک جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ بیس سال کی عمر میں سیکھنے کی صلاحیت رُک جاتی ہے۔ پوری نمو یافتہ ذہنی صلاحیتوں کو ہم نئی نئی ہنرمندیوں

اور دانش کی باتوں کو حاصل کرنے میں انتہائی بڑھاپے میں بھی بروئے کار لا سکتے ہیں۔

زبان کی ابتدا

بولنے سے پہلے بچہ اپنی ضروریات اور محسوسات کا اظہار مختلف قسم کی آوازوں اور اشاروں سے کرتا ہے۔ جب وہ کچھ اُوپر چند ہفتے کا ہو جاتا ہے تو اس کی ماں جاننے لگتی ہے کہ بچے کی یہ آواز بھوک لگنے کی ہے، یہ آواز دکھ کی ہے، یہ آواز غصّے اور ناراضگی کی ہے ذرا اور بڑا ہو جاتا ہے تو بچہ ایسے اشارے کرنے لگتا ہے جن سے بڑوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔

بچّہ کسی زبان کے الفاظ خود ادا کرنے سے پہلے جو زبان سنتا رہتا ہے، اُسے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ بچّے کا غوں غاں کرنا دراصل اُن الفاظ کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے جنہیں وہ سنتا رہتا ہے الفاظ کی آوازوں کو جس طرح وہ دریافت کرتا ہے اُنھیں اُسی طرح ادا کر دیتا ہے، اور اس اظہار میں وہ مسرت بھی شامل ہوتی ہے، جو سیکھے ہوئے الفاظ کے ادا کرنے سے اُسے حاصل ہوتی ہے۔

غوں غاں سے الفاظ تک

غوں غاں سے ترقی کر کے بچّہ مفرد الفاظ ادا کرنے لگتا ہے۔ لفظ کی ادائیگی

کی عمر بچے بچے میں مختلف ہوتی ہے۔ لیکن عموماً ۸ سے ۲۰ مہینے کی عمر تک بچہ ایک ایک لفظ بولنے لگتا ہے۔ ابتدا میں مفرد الفاظ دوسروں کے بولے ہوئے الفاظ کی محض نقل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ الفاظ عموماً پہلی چیزوں اور حالات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جو ہر وقت پیشِ نظر رہتے ہیں، مثلاً اماں، دُدّو (دودھ)، چھام (سلام) آخری نوبت یہ ہوتی ہے کہ مفرد لفظ بچے کی ضرورت کو ظاہر کرنے کے لیے فقرے کا بدل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ زور دینے کے لیے بعض دفعہ اشارے بھی شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر بچہ زور دے کر کہے "جوتی" تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ مجھے جوتی پہنا دو یا میری جوتی اُتار دو۔ اس کا مفہوم اس اشارے پر موقوف ہوتا ہے، جو لفظ کے ساتھ کیا جائے۔

دو سال کی عمر کو پہنچ کر بچہ کئی کئی لفظ اور چھوٹے فقرے صفائی سے بولنے لگتا ہے، اِن الفاظ کو وہ اپنے آپ سے وہ اپنے کھلونوں سے منسوب کر سکتا ہے کیونکہ اُسے اپنی شخصیت اور ذاتی قبضے کا شعور ہونے لگتا ہے مثلاً کہنے لگے گا، میری امی، میری گاڑی، میری کتاب، یہ گڑیا میری۔

جب تین سال کا ہو جائے گا تو فقرے بولنے لگے گا اور الفاظ کو خیال کا ذریعۂ اظہار بنانے لگے گا۔ یہ ٹوپی اچھی نہیں، یہ میری گڑیا بھوکی ہے۔

چار سال کی عمر میں وہ بہت سے سوالات کرنے لگتا ہے۔ اشیاء کے باہمی تعلق میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔ اور کسی خیال کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے عمومی نتائج نکالنے لگتا ہے۔ چار سال کا بچہ روزانہ دس ہزار سے بارہ

ہزار الفاظ تک ادا کرنے لگتا ہے۔

پانچ سال کی عمر میں تیز رفتاری کا اندازِ گفتگو باقی نہیں رہتا۔ خاصی لمبی کہانی سنانے لگتا ہے اکثر جب بولنے پر آتا ہے تو بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ تو اتنا بولتا ہے کہ ماں اگر کسی کام میں مصروف ہو تو تنگ آجاتی ہے۔ اس عمر کے بچے کی ماں شاید سوچتی ہو گی کہ یہ نظریہ کا تحفہ کیا واقعی ایک نعمت ہے۔

بچے کی زبان میں جو اہم ترقی ہوتی ہے اس کا بیشتر حصہ اسکول میں داخل ہونے سے پہلے مکمل ہو چکتا ہے۔ اُسے نہ تو صرف و نحو کا کوئی علم ہوتا ہے اور نہ نظریے کی وضاحت کا، مگر اس کے بولنے کی مہارت بڑھتی جاتی ہے کیونکہ وہ سیکھنے کے لیے تیار ہو چکتا ہے۔

ابتدائی بچپن میں الفاظ ادا کرنے کی صلاحیت آہستہ آہستہ بڑھتی ہے بچپن کے آخری حصے اور سنِ بلوغ میں تیز رفتار وقفوں سے بڑھتی ہے۔

زبان اور ذہانت میں قریبی تعلق ہونے کی شہادت موجود ہے۔ بچوں کے مشاہدے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ طرار بچے عموماً جلدی بولنے لگتے ہیں اور کم ذہانت والے بچوں سے زیادہ اور پختہ الفاظ کا ذخیرہ ان کے پاس ہوتا ہے اور لڑکیاں عموماً سنِ بلوغ تک اپنے ہم عصر لڑکوں سے زبان کی ترقی میں آگے رہتی ہیں۔

پڑھنے کے لئے بچہ کب تیار ہوتا ہے

جب بچہ یہ جاننے لگتا ہے کہ بڑے جو عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہیں

اور روزمرہ کی زندگی میں جو واقعات ہوتے رہتے ہیں ان میں ایک ربطہ ہوتا ہے تو بچہ پڑھنے کی پہلی منزل میں داخل ہوجاتا ہے اِس کے بعد وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ تصویروں، لفظوں، اور زندگی کے تجربے کے درمیان ربطہ ہوتا ہے آخر میں وہ اُس تعلق کو سمجھنے لگتا ہے جو اِس کے تجربات اور بولے ہوئے لفظوں میں ہوتا ہے، اور زبان کی اُن علامتوں کو بھی سمجھنے لگتا ہے جنہیں ہم چھپے ہوئے الفاظ کہتے ہیں۔

اب وہ پڑھ سکتا ہے۔

اکثر والدین سوچتے ہیں کہ بچے کو اسکول میں داخل ہونے سے پہلے بچے کو پڑھانا چاہیئے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشوونما کی طرح پڑھنے میں بھی اِس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ والدین یا معلم بچے کو بعجلت پڑھا سکتے ہیں یا نہیں اور جب بچہ پڑھنے کے لیئے تیار ہوجاتا ہے تو اِس کی تمام کتابیں چھین کر بھی اسے پڑھنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔

کوئی بچہ اسکول میں داخل ہونے سے پہلے پڑھنا سیکھے گا یا نہیں۔ اس کا دارومدار تمام تر اِس بات پہ ہوتا ہے کہ وہ جلدی پختہ ہونے والا ہے یا دیر میں۔ دیر میں پختہ ہونے والے دوسرے اور تیسری جماعت میں بھی پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ جلدی پختہ ہونے والے اسکول میں داخل ہونے سے بہت پہلے تقاضا کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں پڑھاؤ۔

گھر پہ یا اسکول میں اگر بچوں کو پڑھنے کے لائق ہونے سے پہلے پڑھانے کی کوشش کی گئی تو اس کے بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ بچہ جسے قبل

لہٰذا جب پڑھایا جائے اور پڑھ نہ سکے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں نالائق ہوں میرے ماں باپ تو چاہتے ہیں کہ میں پڑھوں مگر میں ہوں کہ پڑھ نہیں سکتا۔

اسکول میں داخل ہونے سے پہلے کی عمر والا بچہ، اسکول میں داخل ہونے والے عمر کے بچے کے مقابلے میں پڑھنے کا اہل اور بھی کم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بہت سے بچے اُس وقت پڑھنا سیکھنے کے لیئے تیار نہیں ہوتے، جب اسکول میں انہیں پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ دیر میں پختہ ہونے والے بچے اپنی اسکول کی زندگی میں قبل از وقت ایک ایسے کام سے دوچار ہوتے ہیں جو انھیں بے حد مشکل نظر آتا ہے اور دیکھتے ہیں کہ دوسرے بچے اُسی کام کو آسانی سے کر رہے ہیں، تو انھیں شکست خوردگی محسوس ہونے لگتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول کے سارے کاموں کے لیۓ ان میں منفی رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک تجربہ

بہت سے ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ بچوں کو پڑھانے کے سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ نہیں ہوتا کہ تعلیم کا آغاز جلد ہی کیا جائے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ دیر میں شروع نہ ہو۔ اسکولوں میں تجربہ کرکے معلوم کیا گیا کہ ابتدائی جماعت میں بچوں کو داخل کرنے کے بعد ڈیڑھ سال تک انھیں پڑھنا شروع کرایا گیا لیکن انھوں نے اس کمی کو پورا کر لیا اور ان بچوں کے ساتھ

چلنے لگے، جنہوں نے اِن سے بہت پہلے پڑھنا شروع کیا تھا، بلکہ بعض تو ان سے بھی بازی لے گئے۔

اِس تجربہ میں ابتدائی جماعت میں داخل ہونے والے ۲۵ بچّوں کو ڈیڑھ سال تک لگی بندھی ہدایات نہیں دی گئیں، مگر پڑھائی کے کمرے میں بہت سی تصویری کتابیں موجود تھیں جنہیں دیکھنے کی انھیں اجازت تھی استانی بچّوں کے سوالوں کے جواب دیتی رہتی اور جب بچّے کہتے تو انھیں کتاب میں پڑھ کر بھی سُنایا کرتی۔ استانی بچوں کے کام بورڈ پر لکھ دیتی اور انہیں پڑھ کر سُنا دیتی۔ یُوں غیر رسمی طور پر اس نے بچوں کو پڑھنے پر راغب کیا۔ اِن بچوں کو نہ تو مشقیں کرائی گئیں اور ان کے امتحان لئے گئے۔

اسکول میں بچّوں کا ایک ایسا گروہ جنہیں مقرّرہ طریقوں سے رسمی تعلیم دی گئی اِس دوسرے گروہ کا مقابلہ، پہلے گروہ کے ۲۵ بچّوں سے ہوتا رہا ان کی زمانی اور ذہنی عمریں یکساں تھیں اور ان کے گھروں کے ماحول بھی ایک سے تھے۔

یہ تجربہ سات سال تک جاری رہا۔ دوسرے سال کے وسط میں تجرباتی گروہ پیچھے رہ گیا۔ چوتھے سال کے ختم پر یہ گروہ نصف تعلیمی سال آگے تھا۔ پھر ساتویں سال تک ترقی کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔

تیسرے سال کے ختم پر ایک ماہر نفسیات نے ان دونوں گروہوں کو جانچا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ گروہ کون کون سے ہیں۔ تیزی، سیکھنے کی خواہش، خود ساختہ چُستی اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں تجرباتی گروہ دوسرے

گروہ سے بڑھا ہوا تھا آٹھویں جماعت کے معلموں نے بھی جانچ کی اور اُنھوں نے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ تجرباتی گروہ ہر لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔

تو واقعہ یہ ہے کہ ہدایات پانے میں تاخیر ہونے سے بچوں کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ فائدہ پہنچا ہے اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ پڑھنے کی قابلیت نہ ہونے پر اس گروہ کے کسی بچے کو احساسِ شکست خوردگی کا عارضہ نہیں ہوا۔ اس میں شکست نہیں کہ اس گروہ کے جلد پختہ ہونے والے بچے پڑھنا بہت پہلے شروع کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے کھوئے

اگر پڑھنا وقت سے پہلے نہ شروع کیا جائے تو بہت سے بچے بہتر طور پر پڑھنا سیکھتے ہیں۔

وقت کی تلافی بڑی تیزی سے کر لی۔ جب آگے چل کر انھیں پڑھائی کی ہدایات ملنے لگیں تو دیر میں پختہ ہونے والے بچوں سمیت کلاس کے سب بچوں نے کامیابی سے پڑھنا سیکھ لیا۔

ایسا ممکن ہے کہ اپنی مقررہ جماعتوں میں دیر سے پختہ ہونے والے بچوں نے شکست خوردگی اور بد دلی محسوس کی ہو، اس پر کہ جو کام انہیں کر لینا چاہیے تھا اُسے وہ نہیں کر سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اِس احساسِ شکست خوردگی نے اگلے سات سال تک اُن کا پیچھا نہ چھوڑا ہو، اور اسی وجہ سے کلاس کا اوسط معیار کم رہا ہو۔

مثبت بات کہئے۔

اسکولوں کے اِن تجربوں سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ بچے اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ سیکھتے ہیں یا نہیں اِس کا دارومدار ہمارے طریقۂ تعلیم پر ہوتا ہے دوسرے تجربوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بچوں کو ہدایات دینے کے لیے بڑے جس قسم کی زبان بولتے ہیں اس کا اثر بچوں کے طرزِ کار پر بہت پڑتا ہے۔

وہ ہدایات جو یہ بتاتی ہیں کہ بچوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ اُن ہدایات سے کہیں کہیں زیادہ موثر ہوتی ہیں، جو بتاتی ہیں کہ بچوں کو کیا نہ کرنا چاہیئے مثال کے طور پر بچوں سے اگر کہا جائے کہ "دائرہ کاٹنا ہو تو کاغذ کے کونے کے پاس سے کاٹو تاکہ کاغذ بچ جائے" بجائے اس کے "کاغذ ضائع مت کرو" تو بچے کاغذ کم ضائع کریں گے "

بچے عام ہدایات سے زیادہ خاص ہدایات کی تعمیل کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم بچے سے کہیں "اِس کھلونے میں چابی اپنی طرف دو" تو وہ سمجھ جائے گا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اور جلدی سے چابی دے گا بجائے اس کے کہ ہم

اس سے صرف یہ کہیں "اس کھلونے میں چابی دے دو" اگر سیدھی سادی ہدایات دے دی جائیں تو لڑکیاں اور لڑکے کئی کئی کام ایک ہی سلسلے میں کر سکتے ہیں مثلاً ہم کہیں "ٹوپی پہن لو۔ اب زنبیل لو۔ بازار جاؤ۔ دروازہ بند کرتے جاؤ"۔ لیکن جو کام آپ لینا چاہتے ہیں اگر اس کے ساتھ ایسی پیچیدہ ہدایات ہوں جن کا کام سے کوئی تعلق نہ ہو مثلاً "ذرا اپنے جوتوں کو تو دیکھو۔ کب سے ان پہ پالش نہیں کی" تو بچہ گھبرا جائے گا اور آپ کا مطلب شاید سمجھ بھی نہیں سکے گا۔ لہذا اگر ہم بچے سے کوئی کام لینا چاہتے ہوں تو ہمیں سیدھا سا حکم دینا چاہئے۔ بچے کو تعمیل کرنے نہ کرنے کا اختیار نہ دینا چاہئے۔ ہمیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ "تم اپنے کھلونے یہاں سے اٹھا کر لے جانا چاہتے ہو؟" ہمیں کہنا یہ چاہئے کہ "اپنے کھلونے یہاں سے اٹھا لے جاؤ"۔

نتیجہ!

بچوں کی ذہنی نشوونما کے لئے والدین اور معلمین بہتر طریق کار اختیار کر سکتے ہیں مثلاً کسی بات کا حکم دینے سے پہلے اگر ہم اس پہ ذرا غور کر لیں تو اسی بات کے کہنے کا کوئی بہتر ڈھنگ ہمیں ضرور مل جائے گا۔ اور اگر ہم اس طریقہ کو اپنا شعار بنا لیں، تو ہمیں معلوم ہو گا کہ بچوں کو بڑھانے میں یہ تعمیری انداز بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

تھکن، بےزاری اور برہمی کی حالت میں ہمارے جذباتی کیفیت ہماری

زبان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جب کوئی ماں تھکی ہوئی یا پریشان ہوتی ہے تو عموماً بگڑ کر چیختی ہے "محمود بند کرو اس بے ہودگی کو"۔ اطمینان سے یوں نہیں کہے گی کہ "محمود میاں دیکھنا بیٹے ہمارا ایک کام کر دو گے!" جس ماسٹر پر کام کا بار ہو گا چیخے گا، چلائے گا، مگر جس ماسٹر پر کام دباؤ کم ہو گا، بچوں کے بے کہے پن پر وہ اس قدر برہم نہیں ہو گا۔

ہم میں سے کوئی بھی ہر لحاظ سے کامل نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے، لیکن اگر ہم ذرا سے تحمل سے کام لیں تو اپنے بچوں کے طرز عمل کو سنوار سکتے ہیں۔ اگر ہم تعمیری انداز میں ان سے بات کریں تو ان کی ذہنی نشوونما کو تقویت پہنچے گی۔

بچوں کو اس کا شوق ہوتا ہے کہ کوئی اچھا کام کریں تاکہ ہم خوش ہو جائیں اور ان کی واہ واہ کریں اگر ہم سیدھے سادے انداز میں ہدایات دے کر ان کی مدد کریں تو زیادہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ بتاتا ہے ڈانٹے ڈپٹنے اور یہ نہ کرو اور وہ نہ کرو کہنے سے اتنے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے، جتنے سمجھانے بجھانے اور لگاوٹ سے مثبت انداز، منفی انداز سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

جو کام بچے کو کرنا ہو اُسے خود کرنے دیجئے، جس طرح وہ چاہے اور جتنی دیر میں وہ چاہتا ہے۔ پڑھنے لکھنے کا کام ہو یا کسی کا بتایا ہوا کام۔ اس صورت میں اس کی نشوونما زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہو گی۔

سب بچوں کی نشوونما مختلف ہوتی ہے!

سب بچے نشوونما کی کسی منزل پر ایک ہی وقت میں نہیں پہنچتے اسے مدِنظر رکھ کر اس نقشے سے آپ کو خاصا صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے جائیں آپ ان کی دیکھ بھال کس طرح کر سکتے ہیں۔

	جسمانی	ذہنی	معاشرتی وجذباتی
پہلا سال	تیزی سے بڑھتا ہے پہلی سالگرہ پر اس کا وزن پیدائش کے وزن سے تین گنا ہو سکتا ہے پہلے دانت ۶ یا ۷ مہینے کی عمر میں نکالے گا۔ اعصابی تناسب بدلتا ہے پیدائش کے مقابلے میں سر نسبتہً کم بڑا ہوتا ہے ہاتھوں سے چیزوں کو پکڑنے لگتا ہے لاتیں چلاتا ہے اور کھسکنے لگتا ہے	چھو کر، چکھ کر، اور سونگھ کر وہ اپنے گرد و پیش سے واقفیت حاصل کرتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے اس میں سے بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے، اور جو کچھ سنتا ہے اس میں سے بعض باتوں کو سمجھنے لگتا ہے بعض کھلونوں کو ترجیح دیتا ہے، جو آوازیں سنتا ہے ان کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔	بھوک لگتی ہے تو بے چین ہوتا ہے یا غصہ کرتا ہے۔ ماں باپ سے محبت کا اظہار کرتا ہے تیسرے یا چوتھے مہینے میں اُن سے مانوس ہو کر متوجہ ہونے لگتا ہے جو اس کے نزدیک رہتے ہیں اور آس پاس جو کام ہوتے رہتے ہیں ان سے دلچسپی کا اظہار کرنے لگتا ہے۔

ابتدائی بچپن ۱ سے ۶ سال تک

ایک سال اور ۱۰ مہینے کے درمیان چلنا سیکھتا ہے طہارت، سونے اور کھانے کی عادتیں رفتہ رفتہ قائم ہو جاتی ہیں ۲ سے ۶ سال تک بڑے پٹھے تیزی سے بڑھتے ہیں۔ حرکی رابطہ ناہموار جسمانی نشو ونما میں لڑکیاں لڑکوں سے ایک سال آگے ہوتی ہیں۔

ایک سال کی عمر میں اماں کہنے لگتا ہے۔ اور ۲ سال کا ہوتے ہی چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے لگتا ہے الفاظ کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی ہے۔ گیت، گھریلو تک بندیاں تصویریں کاٹنا چپکانا، اور رنگ بھرنا اسے پسند ہوتا ہے کئی کھیل سیکھ جاتا ہے، سوال بہت پوچھتا ہے اور مختلف خیالات کا آپس میں تعلق دیکھنے لگتا ہے۔

غصہ اور خود سری کا اظہار کرنے لگتا ہے جواب نفی میں زیادہ دینے لگتا ہے۔ شروع میں اکیلا کھیلتا ہے تیسرے سال میں گروہی سرگرمیوں سے دلچسپی لینے لگتا ہے تخلیقی کھیل پسند کرنے لگتا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں کچھ زیادہ امتیاز نہیں کرتا اعضائے جنسی سے کبھی کبھی کھیلنے لگتا ہے۔ تھوڑی سی ذمہ داری محسوس کرنے لگتا ہے۔

وسطی بچپن ۶ سے ۱۰ سال

رفتار گھٹ جاتی ہے۔ کچے دانت ٹوٹتے ہیں اور پکے دانت نکلتے ہیں۔ جسم زیادہ بڑھتا ہے مگر اعضائے جنسی کم بڑھتے ہیں پٹھوں کا رابطہ اب بھی ناہموار اور نامکمل رہتا ہے چھوٹے پٹھوں سے زیادہ

پڑھنا سیکھتا ہے معلومات اور ہنر مندیوں میں اضافہ ہوتا ہے خیالی کہانیاں، قدرت کی کہانیاں، بہادری کی کہانیاں، ریڈیو اور سینما سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ پڑھنے میں اگر چست ہے تو بہتر پڑھنا سیکھتا ہے کچھ جنسی معلومات حاصل کرتا ہے زیادہ تر گھر کے باہر سے

جنسی محسوسات اور دلچسپیاں بہت بڑھ جاتی ہیں جلق کی بری عادت بڑھ سکتی ہے جنسی محسوسات اور لڑکوں اور لڑکیوں سے مختلف قسم کی دلچسپی کے باوجود مل کر کھیلنے میں کمی۔ زیادہ آزاد، ذمہ داریاں قبول کرنا سیکھتا ہے اور جذبات پر قابو رکھنا سیکھتا ہے

آخری بچپن
۱۰ سے ۱۳ سال تک

بڑے بچوں پر اختیار ہوتا ہے
چابکدستی اور آنکھ جس میں ہاتھ کا ربط
بڑھ جاتا ہے۔

فرق مجھنے لگتا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں
سے کس قسم کے طرز عمل کی توقع کی جاتی ہے

وقت اور روپے پیسے کی قدروں کا کسی
قدر احساس پیدا ہو جاتا ہے۔
صحیح اور غلط کو زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے

ایسے کھیل پسند کرتا ہے جس میں پورا جسم متحرک ہو
زیادہ تیز رفتار نشو ونما۔ پٹھے پھیلتے
ہیں ہڈیاں لمبی ہوتی ہیں۔
جنسی تبدیلیوں کی وجہ سے جسم بھدے
اور بے ڈھل ہو جاتے ہیں۔
لڑکوں کی آواز بدل جاتی ہے۔
لڑکیاں لڑکوں سے پہلے بالغ ہوتی ہیں
دونوں صنفوں میں اعضائے جنسی کے گرد
بے رنگ بال نمودار ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کے
کولہے بھرنے لگتے ہیں اور سینہ ابھر آتا ہے
حیض جاری ہو سکتا ہے۔

تعلیم میں توسیع ہو جاتی ہے۔ ہنرمندیوں اور
معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔
اپنے مسائل کو خود حل کرنے کی کوشش
کرنے لگتا ہے، اور عقلی دلائل سے کام لینے
لگتا ہے۔

جسمانی تبدیلیوں سے پوری طرح مطمئن
نہیں ہوتا
ابھی بڑوں جیسی باتیں کرتا ہے، ابھی
بچوں جیسی غیر ذمہ دارانہ۔
اپنے گروہ کا فرد بننے کی بڑی خواہش
اپنے ہم عمروں میں شامل ہو جاتا ہے۔
بناؤ سنگھار سے دلچسپی ہونے لگتی ہے
صنفِ مخالف سے دلچسپی بڑھتی جاتی
ہے۔

عنوانِ شباب

بڑھنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے، اگرچہ پھر بھی تیز رہتی ہے
لڑکیاں ۱۶ سال کی عمر میں پورا قد نکال لیتی ہیں، لڑکے ۱۸ یا ۱۹ سال کی عمر تک قد بڑھاتے رہتے ہیں
بھوک بڑھ جاتی ہے
جنسی پختگی حاصل ہو جاتی ہے

تعلیم کا رُخ متعین ہو جاتا ہے۔ آئندہ اختیار کرنے والے پیشے کے لحاظ سے۔
مجرّد، اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل اور معاشرتی سوالات سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔
اپنے حاصلِ تعلیم کو زیادہ تنقیدی نظر سے سے دیکھنے لگتا ہے۔

اچھے بُرے مزاج کے دورے پڑنے لگتے ہیں
دوسروں کی محتاجی ختم کرنے کی دُھن سوار رہتی ہے۔
والدین اور معلّمین سے بدلتے ہوئے تعلقات شادی اور پیشے کے مسائل پر غور و خوض
یہ وقت زندگی کے بعض اہم فیصلے کرنے کا ہوتا ہے اس لئے رہنمائی کی اسے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

پانچواں باب

پڑھتے ہوئے بچے کی تعلیم

اسکول کا زمانہ

اسکول میں داخل ہونے سے پہلے کی عمر میں بچے کے والدین کی پوری ذمہ داری ہوتی ہے کہ پختگی حاصل کرنے میں بچے کی ہر ممکن امداد کریں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اسکول اور دوسرے معاشرتی اداروں کو بچے کی نشوونما میں بڑا دخل ہوتا ہے۔

پچھلے زمانے میں ہم یہ سمجھتے تھے کہ اسکول ہی وہ خاص جگہ ہوتی ہے، جہاں ہمارے بچے اپنی ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسکول کا یہ فرض آج کل بھی ہے، مگر صرف ایک حد تک۔ ہمارے بچوں کی جذباتی اور معاشرتی بڑھوتری

پر بھی اسکولوں کا بہت اثر پڑتا ہے۔

کامیاب اسکول وہی ہوتا ہے جو ہر بچے کی انفرادی ضروریات، صلاحیتوں اور نمو کے سانچے کا خیال رکھے۔

اب اس اوسط درجے کے اسکول کے مسائل دیکھیے جو جلدی اور دیر میں پختہ ہونے والے دونوں قسم کے بچوں کو برابر سے اچھی تعلیم دینا ہے۔ آئیے لئیق اور نصیر کے نمو کے سانچوں کا مشاہدہ کریں۔ ان میں سے پہلا "اچھا" طالب علم ہے اور دوسرا "ادنیٰ"، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسکول کی پوری تصویر میں ان کی رفتارِ نمو کیسے کھپتی ہے۔

لئیق، جلد پختگی حاصل کرنے والا

لئیق ساڑھے دس سال کا تھا، مگر حساب کے سوال بارہ سال کی عمر والوں کے برابر حل کر سکتا تھا۔ قابلیت کے امتحانوں سے ثابت ہوا کہ پڑھنے اور سمجھنے میں وہ سترہ سال کی عمر والوں کی برابری کرتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس کی مختلف قابلیتوں کے امتحانوں کے نتیجے جوڑے گئے تو معلوم ہوا کہ اپنے اسکول کے کام میں اتنا آگے بڑھا ہوا تھا جتنا کہ کوئی پندرہ سال کا ہوشیار لڑکا۔

کیا لئیق کوئی مرجھوڑا سا مٹھرا ہوا بچہ تھا جس کا صرف ذہن ترقی پا گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس نے کئی سمتوں سے ترقی کی تھی۔ ساڑھے دس سال کی عمر میں لئیق کی نشو و نما کے نقشے سے معلوم ہوا کہ اس کا وزن ۱۴ سال کے اوسط بچے

کے وزن سے زیادہ تھا، اور اس کے ہاتھ اور کلائی کی ہڈیاں اتنی نمو پا چکی تھیں، جتنی ۱۴ سال کے بچے کی۔ اس کی ذہنی عمر ۱۴ سال والے کے لگ بھگ تھی، اور اس کی گرفتی قوت ۱۲ سال والے سے زیادہ تھی۔ اس کے اعضائے جنسی کے گرد کے بال ۹ سال کی عمر میں نکل آئے تھے۔ عمر کے لحاظ سے اس کی عام رفتارِ نمو اِس کے پکّے دانتوں کے نکلنے سے ثابت تھی۔ اس کے پکّے دانت بھی اُسی عمر میں نکلے جس عمر میں دوسرے بچّوں کے نکلتے ہیں۔

لئیق نے اسکول میں جو اتنی ترقی دکھائی اِس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ایک جلد پختہ ہونے والا لڑکا تھا۔

نصیر دیر میں پختگی حاصل کرنے والا

لئیق کی جماعت میں سب سے دیر میں پختہ ہونے والا لڑکا نصیر تھا ساڑھے دس سال کی عمر میں وزن، قد، اور ذہنی عمر میں اوسطاً بہت کم تھا۔ صرف گرفتی قوت اور ہاتھ کی ہڈیوں کی عمر کے لحاظ سے ذرا سا زیادہ تھا۔ اس کے اعضائے جنسی کے گرد بال نمودار نہیں ہوئے تھے۔ اسکول کے کاموں میں بھی وہ اوسط سے نیچے تھا۔ اس کی پڑھنے کی عمر ساڑھے دس سال سے کم تھی۔ عام تعلیم حاصل کرنے کی عمر دس سال سے کم تھی۔ حسابی عمر دس سے کم تھی، اور ہجے کرنے کی عمر آٹھ سال کی تھی۔

اسکول کے کاموں میں کامیابی اور ناکامی کا جو فرق اِن دونوں لڑکوں میں تھا اس کا سبب کیا تھا؟ اسکول میں دونوں کو ایک سے سبق ایک سے طریقے

سے پڑھائے جاتے تھے ان کے گھروں کا معیار بھی ایک جیسا ہی تھا۔

ان دونوں میں جو بہت بڑا فرق رہا، اس میں اسکول کی تعلیم کا کوئی تصور نہ تھا۔ یہ فرق ان کے نشوونما کے سانچوں اور رفتارِ نمو میں فرق ہونے کی وجہ سے تھا نصیر کے معلم اُسے آگے بڑھانے کی چاہے جتنی کوشش کر لیتے اُسے لیق کی طرح تیز ذہن نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ نصیر کی تعمیر لیق کی طرح ہوئی ہی نہ تھی۔

پڑھنے کی قابلیت میں فرق

دونوں بچوں کی عمر ساڑھے دس سال کی ہے مگر اُن کی نشوونما اور قابلیتوں میں بہت فرق ہے

یہ دیکھنے کے لیے بچوں کی قابلیت میں کتنا فرق ہوتا ہے آئیے ہم اُن ۲۸ بچوں کا تعلیمی ریکارڈ دیکھیں جو لیق اور نصیر ہی کے اسکول میں پڑھتے تھے۔

نظریاتی طور پر جماعت کے ہر لڑکے کو اسکول کے ایک سال میں قابلیت کو بھی ایک سال بڑھانا چاہیئے، لیکن حقیقت میں ان کی تعلیمی نمو

میں بہت فرق تھا۔ مثال کے طور پر ۸ سال کی عمر میں تین لڑکوں کی تعلیمی عمر ۶½ سال کی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اِن کے پڑھنے کی قابلیت وہ تھی جو ۶½ سال کے اوسط بچے کی ہوتی ہے، اور تین لڑکوں کی تعلیمی عمر دس سال کی تھی یعنی ان دونوں گروہوں میں ۳½ درجوں کا فرق تھا۔ جب سب بچے دس دس سال کے ہوئے تو تین سب سے سست بچوں کی پڑھنے کی عمر کوئی ۸ سال کی تھی، اور سب سے تیز تین لڑکوں کی پڑھائی کی عمر ۱۲½ سے لے کر ۱۵ سال سے اُوپر تک تھی۔ یعنی سات درجوں تک کا فرق تھا۔ ایک ہی جماعت میں اتنا بڑا فرق پایا جاسکتا ہے۔

لڑکیوں کے ایک گروہ کا ایسا ہی ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان کے پڑھنے کی قابلیت میں بھی بہت فرق موجود تھا، مگر یہ فرق اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ لڑکوں میں لڑکیاں چونکہ لڑکوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ پختہ ہوتی ہیں۔ اس لیے اِن کی اوسط پڑھنے کی عمر لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہے، خصوصاً ابتدائی عمر میں۔

فرض کیجیے آپ لئیق اور لطیف کے اسکول میں پڑھاتے ہیں بچوں کی پڑھنے کی قابلیت دوسرے درجے کے معیار سے نویں جماعت کے معیار تک ہے۔ کیا آپ ان سب بچوں کو ایک ہی کتاب کے چند صفحے یکساں طور پر پڑھنے کے لیے دیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ یہ کبھی نہ کریں گے کیونکہ اس طرح ہر بچے کو فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔

ہر بچے کی صلاحیتیں اور رفتارِ نشو و نما اپنے ہم جماعتوں سے اُس درجہ

مختلف ہو سکتی ہے، اس لیے معلم کا کام بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ صغیر اور حمید تیسرے درجے ہی میں پانچویں درجے کی مشکل کتابیں پڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن حنیف اور محمود صرف پہلی جماعت کے معیار کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کلاس سے کہیں کہ تیسری کتاب کے ۱۰ سے ۱۵ تک کے صفحے پڑھو تو صغیر اور حمید اس سبق کو ذاتی سمجھ کر اکتا ئیں گے اور حنیف اور محمود اسے سمجھ نہ سکیں گے۔

بہتر یہ ہوتا کہ بچوں کے گروہ کو ایسا بہت سا سبق دینا چاہیے جو کچھ مشکل بھی ہو اور دلچسپ بھی بچہ ان باتوں کو اپنے لیے انتخاب کرے گا جن کے لئے وہ تیار ہے اور اپنی انفرادی رفتارِ نمو کے مطابق ترقی کر سکے گا۔ اگر مشکلات اور دلچسپیوں کا بڑا ذخیرہ انتخاب کے لیے موجود ہو تو بچے عموماً ایسے کام

تعلیم میں بھی "حسبِ مقدور" کا خیال رکھنا چاہیے۔

کو اپنے لیے منتخب کر لیتے ہیں، جس سے اپنی صلاحیتوں کے وہ جلد از جلد ترقی کر سکیں۔ بچے ایسے تعلیمی ذخیرے کو قبول نہیں کرتے جس سے انھیں ناکامی کا اندیشہ ہو۔

آگے بڑھایا جائے یا نہ بڑھایا جائے

بعض ماہرینِ تعلیم کہتے ہیں کہ بچوں کو ہر سال آپ سے آپ ترقی نہیں مل جانی چاہیئے، کیونکہ اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ پاس تو ہو ہی جائیں گے تو وہ محنت سے نہیں پڑھیں گے۔ اِس نظریہ کا امتحان ایک اسکول میں کیا گیا۔ ایک کلاس کے لڑکوں سے سال کے شروع میں کہہ دیا گیا کہ اگلے سال تم سب کو جماعت چڑھا دیا جائے گا۔ ایک اور کلاس کے لڑکوں کو بار بار یاد دلایا گیا کہ تمھیں خوب پڑھنا چاہیئے، ورنہ تمھیں جماعت نہیں چڑھایا جائے گا۔

ان دونوں طریقوں میں بچوں نے جو ذاتی کوشش کی اس میں بظاہر کوئی فرق نظر نہ آیا، لیکن امتحان لینے پر معلوم ہوا کہ جن بچوں کو جماعت چڑھانے کا یقین دلایا گیا تھا اُنھوں نے اُن لڑکوں سے بہتر کام کیا جنھیں فیل ہونے سے ڈرایا گیا تھا، اور وہ بچے خوش بھی زیادہ رہے۔

اسی طرح کے اور مشاہدے بھی کئے گئے، جو اسکول سال کے اختتام پر سب بچوں کو پاس کر دیتے ہیں۔ ان کا مقابلہ ایسے اسکولوں سے کیا گیا جو دیر میں پختہ ہونے والے بچوں کو فیل کر دیتے ہیں وہ دیر میں پختہ ہونے والے بچے جو اپنی عمر کے لڑکوں کے ساتھ پاس ہوتے چلے جا رہے تھے، وہ اتنی ہی اچھی طرح چل

رہے تھے اتنی اچھی طرح کہ فیل کئے ہوئے دیر میں پختہ ہونے والے بچے جو نیچے کی جماعتوں میں اپنے سے کم عمر بچوں کے ساتھ چل رہے تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر غیر معمولی حالات نہ ہوں تو دیر میں پختہ ہونے والے بچوں کو ایک سال سے زیادہ ایک جماعت میں رکھنا مناسب نہیں ہوتا لیکن جلدی پختہ ہونے والے بچوں کو اکٹھی دو جماعتیں چڑھانے کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جلدی پختہ ہونے والا بچہ عموماً معاشرتی طور پر بھی اتنا ہی آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے جتنا کہ ذہنی طور پر لیکن وہ خوش اسی صورت میں رہ سکتا ہے جب اس سے بڑی عمر کے بچے بھی اسے قبول کریں بارہ سال کا غیر معمولی ذہین بچہ ہو سکتا ہے کہ کالج کی تعلیم کو مشکل نہ سمجھے اور کالج کی زندگی کے کئی معاشرتی پہلوؤں سے بھی اسے دلچسپی ہو مگر کالج کی عمر کے ایسے کیسے گوارا کریں کہ ایک بارہ سال کا لڑکا معاشرتی طور پر ان کی برابری کرے۔؟

اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ بہت ذہین بچے اکثر اپنی عمر کی مناسبت ہی سے اپنی کلاس میں آگے بڑھے رہتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک یا دو کلاس آگے ہوں۔ ایسے ذہین بچے کئی کلاس آگے کا کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے والدین اور معلم محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہ بچے اپنی عمر کے لحاظ سے اپنے ہم عمروں ہی کے ساتھ پڑھیں تو ان کی معاشرتی ہم آہنگی بہتر طور پر ہو سکے گی۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ایسے ذہین بچے ان اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں جن میں بچوں کی بھرمار ہو تو انھیں اسکول کی پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں

ہوتی۔ ایسے تیزی سے پختہ ہونے والے بچوّں کو استاد اجازت دے دیتے ہیں کہ اپنے خالی وقت کے لیے خود ہی کتابوں یا کاموں کا انتخاب کریں۔

اُستادوں کے لیے یہ کام کچھ آسان نہیں ہوتا۔ بچوّں کو صرف مصروف رکھنے سے کام نہیں چلتا۔ اُستاد کی دسترس، قابلیت، تصوّر اور فہم سبھی کو بروئے کار لاکر وہ سامان اور سرگرمیاں مہیا کرنی ہوتی ہیں، جن میں سے بچوّں کو انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

کِس قِسم کی گروہ بندی سب سے اچھی ہوتی ہے؟

بچوں کے گروہ چاہے جیسے بنائے جائیں ہر بچہ اپنی ہی صلاحیتوں کے مطابق سیکھتا ہے۔ بعض دیہات کے اسکول ہوتے ہیں کہ ایک ہی کمرے میں چھ جماعتیں ہوتی ہیں، اور بعض اسکول ایسے ہوتے ہیں کہ ایک کمرے میں آدھی جماعت ہوتی ہے، مگر بچےّ انفرادی طور پر صرف اتنا ہی سیکھتے ہیں جتنی ان میں صلاحیت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں سیکھ سکتے۔

بچوّں کے گروہ چاہے عمر کی بنیاد پر بنائے جائیں، چاہے تعلیمی قابلیت کے اعتبار سے، چاہے ذہانت کے امتحان لے کر ہر لحاظ سے وہ یکساں سیکھتے ہیں اگر بچوں کے گروہ ششماہی طریقے سے بنائے جائیں اور سال میں دو دفعہ انھیں ترقی دی جائے، تب بھی اِن کے پڑھنے اور سیکھنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے اس طریقے کو اکثر اسکولوں میں ترک کیا جا رہا ہے۔

اگر بچوّں کی تعداد اتنی کم ہو کہ ایک استاد ایک کمرے میں اُنھیں پڑھا سکے تو اور بات ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ بچوّں کے گروہ کسی نہ کسی لحاظ سے بنانے ہی

پڑیں گے اگر ایک گروہ کے بچوں میں زیادہ فرق نہ ہو تو استاد کا کام آسان ہو جاتا ہے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کلاس کون سی ہے، بلکہ یہ اتنی ادنیٰ بات ہے کہ بعض ماہرینِ تعلیم اِس تقسیم کو کوئی حیثیت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ بچوں کو اجازت ہونی چاہیئے کہ جن کمروں کو پسند کریں اُن میں جا بیٹھیں جس کمرے میں بچے کو اپنے زیادہ دوست دکھائی دیں اِس میں چلا جائے یا طریقۂ تعلیم دوسرے طریقوں سے کچھ کم مفید ثابت نہیں ہوتا۔

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک ہی جماعت کے بچوں میں اتنا زیادہ فرق ہوتا ہے کہ جماعت بندی کا طریقہ اگر چھوڑ دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا یہ طریقہ محض اِس لئے باقی ہے کہ بچوں کو اِس طرح یکجا کیا جا سکتا ہے۔ جماعت میں سے بھی جب ٹولیاں یا گروہ بنائے جاتے ہیں تو بچوں میں اتنے فرق ہوتے ہیں کہ استاد کو ہر بچے کے لیے مختلف مواقع بہم کرنے پڑتے ہیں۔

رپورٹ کارڈ اور کانفرسیں

بچوں کی ٹولیاں چاہے جیسی بنائی جائیں والدین چاہتے ہیں۔ اور انھیں اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ وقتاً فوقتاً انھیں اطلاع ملتی رہے کہ ان کے بچے نے کتنی ترقی کی۔

رپورٹ کارڈ سے بچے کے والدین کو یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں ان کا بچہ پڑھنے میں، حساب میں، اور دوسرے مضامین میں کیسا ہے مگر ان کارڈوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی انفرادی نشوونما کا کیا حال ہے،

یا اس کے خاص خاص مسائل کیا ہیں، یا جتنی ترقی وہ کر سکتا ہے اس میں کتنی ترقی کر رہا ہے۔

اختر کو مثال کے طور پر لیجئے۔ یہ دیر میں پختہ ہونے والا لڑکا ہے۔ اس کے رپورٹ کارڈ کے نمبروں کی کمی سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لیے وہ کتنی زیادہ محنت کر رہا ہے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ پچھلی رپورٹ کے مقابلے میں اب کے اُس نے واقعی ترقی کی ہے، مگر یہ ترقی اتنی نہیں ہے کہ اس کے نمبروں میں کچھ زیادہ فرق دکھائی دے۔ کارڈ سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کے نمبروں میں کمی محض اس وجہ سے رہی کہ اِس کا اپنا نمو کا سانچا ہی سست رفتار ہے۔ دوسری مثال حمید کی ہے جو جلدی پختہ ہونے والا لڑکا ہے۔ اس کا روایتی قسم کا رپورٹ کارڈ یہ نہیں بتاتا کہ وہ دراصل جتنی کوشش کر سکتا ہے، اتنی نہیں کر رہا، اور اس کی ترقی اتنی زیادہ نہیں جتنی زیادہ کہ اس کے اپنے نمو کے سانچے کے مطابق ہونی چاہیئے۔

بچوں کی کوشش اور ترقی کا بہت غلط اندازہ رپورٹ کارڈوں سے ملتا ہے۔ ان کے انفرادی نمو کے سانچوں میں ان سے کہیں زیادہ صلاحیتیں ودیعت ہوتی ہیں۔ لہٰذا رپورٹ کارڈوں کے علاوہ ان کا اندازہ کرنے کے لیے چند اور طریقے بھی وضع کیے گئے۔ بچوں کے کاموں اور ترقی کو ظاہر کرنے کے لیے بعض اسکولوں میں صرف "تسلی بخش" اور "غیر تسلی بخش" کی اصطلاحیں اختیار کی جاتی ہیں بعض اسکولوں میں معلّمین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ بچوں کی ترقی کا اندازہ ان کی کوششوں کو مدِنظر رکھ کر کیا جائے اور انھوں نے جو کچھ واقعی حاصل

کیا ہوا اُسے پیش نظر نہ رکھیں۔ ایسے بھی اسکول ہیں جن میں رپورٹ کارڈ ترک کر دیئے گئے ہیں اور معلّم بچّے کی ترقی پر والدین کی اطلاع کے لیئے ایک غیر رسمی رپورٹ لکھ دیا کرتا ہے۔ اگرچہ یہ طریقے کسی حد تک بہتر ثابت ہوئے ہیں، پھر بھی انھیں ہر لحاظ سے مکمل نہیں کیا جا سکتا۔

والدین کو ان کے بچوّں کی ترقی سے آگاہ کرنے کے لیئے ایک زیادہ پُرمعنی طریقہ والدین اور معلّمین کے درمیان باقاعدہ ذاتی کانفرنسوں کا ہے۔ بہت سے اسکولوں میں معلّمین والدین سے کانفرنسیں صرف اُس وقت کرنی ضروری سمجھتے ہیں جب کسی اہم مسئلہ پر انھیں گفتگو کرنی ہو۔ یہ حالت ناخوشگوار ہوتی ہے، لیکن اگر والدین سے معلّم باقاعدہ ملتے جلتے رہیں تو والدین اور معلّم دونوں پتا چلا سکتے ہیں کہ بچہ ٹھیک چل رہا ہے یا نہیں۔ گھر اور اسکول میں بچّے کی جذباتی اور معاشرتی ہمواری پر دونوں مفصّل گفتگو کر سکتے ہیں۔ اِس گفتگو میں بچّے کی نشوونما کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔

معلّم والدین سے اپنے شاگرد کے گھریلو پس منظر کو اچھی طرح جان جانے کے بعد، اسکول میں بچّے کے طرزِ عمل کو بہتر طور پر سمجھ سکے گا۔ معلّم سے اپنے بچّے کے اسکول کے مسائل کو جان جانے کے بعد والدین اپنے بچّے کی مدد گھر پر زیادہ اچھی طرح کر سکیں گے۔

اَب ہم کیا کر سکتے ہیں

ہمارے اسکولوں میں تعلیم کا جو طریقہ ہے غالباً اِس میں جلدی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ اِس لیئے ہمیں حقیقت پسندی سے کام لے کر اسکول کے نظام

کے پیشِ نظر اسکولوں کے مسائل کا
حل تلاش کرنا چاہیئے۔

ہم یہ خواہش کریں گے کہ والدین
اور معلّمین کی کانفرنسیں زیادہ وسیع
کی جائیں، اور شاید آگے چل کر ایسا
ہو بھی جائے، لیکن اِن کانفرنسوں
میں وقت بہت صرف ہوتا ہے
اکثر اسکولوں میں ماسٹروں کے ذمّے
اتنے زیادہ کام ہوتے ہیں کہ اگر
ان میں ایک کام کا بھی اضافہ کیا گیا
تو سارے کام ہی بگڑ جائیں گے
موجودہ حالات میں والدین کو مروّجہ
رپورٹ کارڈوں پر اکتفا کرنا ہوگا

والدین اور معلّمین کی ملاقاتوں سے بچّے کی نشوونما
کا زیادہ صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

اور جو کسر ان میں رہ جاتی ہے اُسے اپنے طور پر پورا کرنا چاہیئے۔
اگر بچّہ دیر میں پختہ ہونے والا ہے تو والدین کو اس کے کم نمبروں پر ناراض یا خفا
ہونا چاہیئے بلکہ بچّے پر یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ تم پوری محنت کر رہے ہو تو کم نمبر
ملنے کا ہمیں ملال نہیں ہے۔ بچّے احساس اعتماد کو اس طرح بڑھانا چاہیئے کہ
اُسے ایسے گھریلو کاموں میں لگایا جائے، جو تخلیقی ہوں مگر یہ کام ایسے ہونے
چاہئیں جو اس کی صلاحیتوں سے بڑھ کر نہ ہوں۔

فریدتقسیم کے سوال بس نکال ہی لیتا ہے، مگر ایسے کتنے لڑکے ہیں جو فوراً ہی حل کر لیتے ہیں! اگر بچوں کی مناسب حوصلہ افزائی کی جائے تو ایک باپ کی کمی کا تدارک دوسرے باپ میں حیرت انگیز ترقی کے ساتھ کر لیتے ہیں اور اسے یہ خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے کسی ہنرمندی کے کام میں حاصل ہو جاتا ہے ذاتی صفات میں، اس مخصوص کامیابی کے سہارے وہ اپنی مطمئن زندگی تعمیر کر سکتا ہے۔

اگر بچہ جلد پختہ ہونے والا ہو تو دانش مند والدین اُسے بتا سکتے ہیں کہ زیادہ ہنر حاصل کرنا کوئی بڑے فخر کی بات نہیں ہوتی۔ بچے کو سمجھا سکتے ہیں کہ جو بچے تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور جلدی کسی بات کو سمجھ لیتے ہیں تو اس سے انہیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم دوسرے بچوں سے بہتر ہوں انہیں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھا دینی چاہیئے کہ ہر شخص کو اپنی صلاحیت پوری طرح بروئے کار لانی چاہیئے اور کسی کام کو آسان سمجھ کر اس کا مذاق اڑانا اچھی بات نہیں ہوتی۔ اگر بغیر کوشش کے اچھے نمبر مل جاتے ہوں تو اس پر فخر و ناز نہ کرنا چاہیئے۔

گھر اور اسکول کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ بچے چاہے دیر میں پختہ ہوں چاہے جلدی، سب بچوں کی مدد کی جائے تاکہ ان کی صلاحیتیں پوری طرح اُبھر آئیں۔ افسوس کی بات ہے کہ آج کل اکثر بچوں کی اتنی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی یا انہیں اتنا شوق نہیں دلایا جاتا کہ وہ اپنی پوری قابلیت کے ساتھ کام کریں۔ اس کوتاہی کے شاید مختلف اسباب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بچوں کے لیے تعلیم کا جو مقصد متعین کیا جاتا ہے وہ یا تو بہت پست ہوتا ہے

یا بہت بلند۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو تعلیمی مواد بچوں۔ کے لیے مہیا کیا گیا اس میں بچوں کے لیے کوئی دلکشی نہ ہو۔

مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ بچے ان کاموں کا بچنا چاہتے ہیں، جنھیں انجام دینا ان کی قابلیت سے باہر ہو، اور اُن کاموں کو انجام دینے پر مُصر رہتے ہیں جن میں انھیں کامیابی کی اُمید ہو۔ اس کے علاوہ جو کام بچوں کو دیئے جائیں وہ ایسے ہونے چاہئیں، جو بچوں کی دلچسپیوں اور تجربوں کے مطابق ہوں۔ جو مقاصد ہوں ان کا راست تعلق کاموں سے ضرور ہونا چاہیئے۔

بچے کے لیے ایسا بامعنی اور اُکسانے والا تعلیمی مواد مہیا کرنا چاہیئے جو اس کی قابلیت اور صلاحیت کے دائرے میں ہو۔ یوں نتائج بہتر نکلیں گے اور اس کے سیکھنے کے تجربات زیادہ اطمینان بخش ہوں گے۔ تعلیم کا حقیقی مقصد اس طرح پورا ہو سکے گا۔ یعنی پسندیدہ معاشرتی سمتوں میں بچے کی بیش از بیش نشو و نما۔

وہ اسکول جو آبادی کے تمام بچوں کی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانے میں بچوں کی مدد کرتا ہے، قوی تر عوام اور قوی تر قوم کی تعمیر کرتا ہے۔
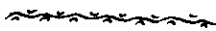
چھٹا باب

بچّوں کی جذباتی اور معاشرتی نشوونما

لڑکا بڑھ کر چھ فٹ کا ہو سکتا ہے۔ سالہا سال پڑھ کر عالم و فاضل کی سند حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جسمانی، ور روحانی بلندیوں کے حاصل کر لینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ہر لحاظ سے پختہ اور مکمّل نشوونما یافتہ فرد بن گیا دوسرے لوگوں سے اس کے تعلقات نہایت بچکانہ ہو سکتے ہیں اس کی خواہش یہ ہو سکتی ہے کہ سب لوگ ہر وقت اسی کی طرف متوجہ ہوں۔

ذہنی اور جسمانی نشوونما کافی نہیں ہوتی۔ اگر بچّے کو بڑھ کر مسرور اور ہموار جوان بننا ہو تو اس کی معاشرتی اور جذباتی نشوونما بھی پوری طرح ہونی چاہیئے دوسروں سے محبت کرنے کی اس میں صلاحیت ہونی چاہیئے، اور

اپنے اور دوسروں کے متعلق ذمہ داریاں قبول کرنے کی قابلیت ہونی چاہیئے۔

قدم بہ قدم

نشوونما کے مختلف پہلو ہیں، جذباتی اور معاشرتی نمو کو سمجھنا بعض لوگوں کے لیے کسی قدر دشوار ہوتا ہے۔ بچے کی معاشرتی اور جذباتی نمو کی فہم نسبتہً اس لئے دشوار ہوتی ہے کہ جسمانی اور ذہنی نشوونما کی علامتوں کی طرح اِن پہلوؤں کی علامتیں واضح اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتیں اور نمو کے اِن نازک پہلوؤں کی پیمائش بھی دشوار تر ہوتی ہے، لیکن اگر ہم کسی بچے کا سالہاسال تک مطالعہ کرتے رہیں، تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ بچے میں واقعی جذباتی اور معاشرتی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس باب میں بھی بچے کا انفرادی دروں ساختہ سانچا ہی اس نشوونما کا بھی ضامن ہوتا ہے۔

چار سال کی عمر میں بشیر اپنے ساتھ کھیلنے والے ناصر کو اس لئے مارنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس کا کھلونا کیوں چھین رہا ہے۔ ماں محبت سے منع کرتی رہتی ہے۔ مگر بشیر کوئلے سے دیوار کالی کرتا رہتا ہے۔ گرمیوں میں شربت پینے سے انکار بھی کر دیتا ہے، محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُسے حکم ماننے سے انکار ہے اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ خواہش بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ گھر جل کر خاک ہو جائے تاکہ اماں گھر کے کام دھندوں سے چھوٹ کر تمام تر توجہ اسی پہ صرف کرے۔

ایسا لگتا ہے کہ بشیر بڑا خود پسند بچہ ہے لیکن اس کی عمر کے تقریباً سارے ہی بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بچے چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم چاہیں اور جب

چاہیں ہمیں فوراً مل جائے۔ وہ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ماں یا باپ یا کوئی اور اُن سے کہے "نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا" رفتہ رفتہ انہیں اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ انہیں سب سے زیادہ محبت اور پسندیدگی درکار ہوتی ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ والدین اگرچہ ان سے محبت کرتے ہیں لیکن یہ محبت اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ جو کچھ بھی وہ کریں گے اسے پسند کر لیا جائے گا وہ جان جاتے ہیں کہ اس دنیا میں آرام سے رہنے اور دوستوں میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ اپنی ہر مرضی کو منوا سکیں مختصر یہ کہ ان کی جذباتی نمو بھی بالکل اسی طرح ہوتی ہے۔ جیسے قد اور وزن اور ذہنی قابلیت کی بڑھوتری۔

معاشرتی اور جذباتی نمو مکمل ہوتی ہے لیکن نشوونما کے دوسرے پہلوؤں کی طرح سب بچوں کی رفتارِ نمو یکساں نہیں ہوتی۔ بعض بچے اپنے ہم عصروں سے زیادہ ذمہ داریاں اور مختلف قسم کی ذمہ داریاں قبول کرتے ہیں۔

مثلاً جلد پختہ ہونے والی پانچ سال کی سلمیٰ بالکل مطمئن ہے کہ اپنے کپڑے پوری طرح خود پہن سکتی ہے اس میں یہ خصوصیت بھی ہے کہ گھنٹوں خاموش بیٹھی ریڈیو سنتے جائے گی اور خوش ہوتی رہے گی، مگر دیر میں پختہ ہونے والا اسی عمر کا انجم پہلو بدلنے لگتا ہے اور نظر بچا کر وہاں سے کھسک جاتا ہے۔ انجم اس قسم کے معاشرتی معاملات کو قبول کرنے کے لیے ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔

اگر کوئی بچہ سینما میں نچلا نہیں بیٹھ سکتا تو سمجھنا چاہیے اس کی عمر ابھی اتنی نہیں ہوئی کہ اُسے ساتھ لے جایا جائے۔ اگر وہ اپنے کوٹ کے بٹن خود نہیں لگا سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اس کی عمر اتنی کم ہے کہ اُسے خود بٹن لگانے پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔

بحیثیت والدین اور معلمین کے ایک ذمہ داری ہماری یہ بھی ہے کہ بچوں کو ان دشوار باتوں کے حل کرنے پر مقرر نہ کریں جو ان کی عمر کے لحاظ سے ان کے مناسب حال نہ ہوں۔ ہمیں اپنے مطالبات میں اس نوع کی کتر بیونت کرنی چاہیے کہ بچے کی قابلیت پر ان کا بار نہ پڑے۔

نمو کی نمایاں علامتیں

پیدائش کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچے کو دوسروں کے وجود سے بالکل بے خبری ہوتی ہے، لیکن وہ دوسرے یا تیسرے مہینے میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے، اور جو کچھ اس کے آس پاس ہوتا رہتا ہے اس سے دلچسپی لینے لگتا ہے۔

چند اور بھی نمایاں علامتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر بچے کو بھوک لگ رہی ہو یا وہ بے آرام ہو تو غصے کا اظہار کرے گا۔ بچہ جیسے جیسے پختہ ہوتا جاتا ہے اس کا غصہ ارادوں کے تصادم یا اس کشمکش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو اس کی اپنی اور اپنے والدین معلمین یا دوستوں کی خواہش کے درمیان ہوتی رہتی ہے۔

اسی طرح کم سن بچہ جب ناراض ہوگا تو جو چیز بھی حائل ہوگی یا جو شخص بھی رکاوٹ ثابت ہوگا اُسے مارنے پر پل پڑے گا۔ جب ذرا اور بڑا ہوتا ہے تو جسمانی نفرت کے مظاہرے کا بدل الفاظ سے ہونے لگتا [illegible] اس کے غصے کا ہدف اصل سبب بننے لگتا ہے۔

ایک سال کی عمر سے چھ سال کی عمر تک بچہ اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے۔

کوئی اور اگر اس پر حکم چلائے تو اُسے غصہ آجاتا ہے۔ خاص طور پر دو سال کی عمر میں وہ ہر بات پر "نہیں" کہا جاتا ہے۔ اسی ایک سے چھ سال کی عمر میں وہ گالیاں دینے میں بھی لطف محسوس کرنے لگتا ہے۔

قبل مدرسہ کی عمر میں بچہ یا تو اکیلا کھیلتا رہتا ہے یا چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بناکر کھیلتا ہے اس عمر میں وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں تمیز نہیں کرتا لیکن لڑکے عموماً مار پیٹ کی طرف راغب ہوتے ہیں اور لڑکیاں زبانی جمع خرچ زیادہ کرتی ہیں۔

اسکول کے پہلے سال میں ہم آہنگی کے بعض مسائل رونما ہو سکتے ہیں، خصوصاً اس بچے کے لئے جو اپنے گھر میں سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہو۔

وسطی عہدِ طفولیت میں بچے اپنے جذبات پر نسبتہً زیادہ قابو پانے لگتے ہیں، دوسرے بچوں کے ساتھ کچھ گھلنے ملنے لگتے ہیں۔ تھوڑی سی ذمہ داری بھی قبول کرنے لگتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے طرزِ عمل کے فرق کو بھی کسی حد تک سمجھنے لگتے ہیں۔

اسی وسطی عہدِ طفولیت میں بچے ایک دوسرے سے صحیح اور غلط جنسی معلومات حاصل کرنے لگتے ہیں۔ اس کا اندازہ بچوں کے بزرگوں کو نہیں ہوتا کہ بچہ کیا سیکھ رہا ہے۔ بڑوں کو چاہیئے کہ اس موقع پر بچوں کو جنس کے متعلق ذرا تفصیل سے معلومات بہم پہنچائیں چھٹپن میں جو کچھ انھیں بتایا گیا اس سے کسی قدر زیادہ انھیں بتانا چاہیئے۔

سنِ بلوغ اور خصوصاً عنفوانِ شباب میں کبھی تو ایسا معلوم ہوگا کہ بچہ جوان ہوگیا اور بغیر کسی سہارے کے زندگی بسر کرنے کے لائق ہوگیا، اور کبھی ایسا

معلوم ہوگا کہ ابھی بالکل بچہ ہی ہے اور کسی ذمہ داری کا اُسے احساس نہیں ہے
یہ صورت حال میں مطابق فطرت ہوتی ہے یہ بھی اس کیفیت کو ظاہر کرتی ہے
کہ جسمانی نشوونما کا قریبی تعلق معاشرتی اور جذباتی نمو سے ہوتا ہے۔

جمیلہ اپنے اُبھرتے ہوئے سینے اور کولھوں کی گولائی اختیار کرنے پر پریشان
ہے اس زمانے میں ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر اس تبدیلی کو چھپانا چاہتی ہے
اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ گھنٹوں اُٹھتی بیٹھتی ہے کیونکہ وہ سب بھی اُسی کی
طرح ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوتی ہیں۔

ابتدائے سنِ بلوغ میں اقبال اپنے بے ڈول ہاتھ پاؤں اور بدلتی ہوئی آواز
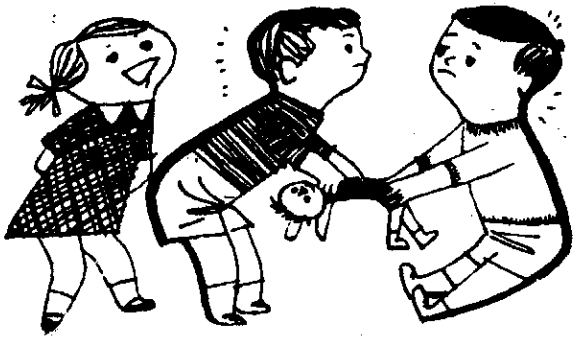
چھوٹے لڑکے لڑکیوں سے زیادہ لڑنے بھڑنے پہ مائل ہوتے ہیں

سے گھبرانے لگتا ہے اس کے ہم عمر بھی اسی منزلِ دشوار سے گذرتے ہیں اس لیۓ انبال انہی کے ساتھ لگا رہتا ہے انھی سب کی وضع اختیار کرتا ہے تاکہ طمانیت حاصل کرتا رہے،

دوسرے اُن بچوں سے اپنی شکل و شباہت ملاکر جو اسی دورِ تجربات سے گذر رہے ہیں جوان ہونے والا لڑکا اپنی جسمانی تبدیلیوں کی طرف سے آسودگی حاصل کرتا ہے۔ نشوونما کے دوسرے پہلوؤں کی طرح جن پر ہم اظہارِ خیال کر چکے ہیں ۔ عنفوانِ شباب کے بچوں کو ہم جلدی سے اس پہ آمادہ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی جسمانی تبدیلیوں کو قبول کر لیں۔ جب وہ اُن تبدیلیوں کی طرف سے بے فکر ہو جائے گا جو اس کے اندر واقع ہو رہی ہیں تو اس کا بیرونی طرزِ عمل بھی از خود بدل جائے گا۔

عنفوانِ شباب میں بھی لڑکے اور لڑکیاں دونوں جنسِ مخالف سے دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں آپس میں طویل گفت و شنید کر کے واضح طور پہ اپنی جنس کی اہمیت کو جان جاتے ہیں اور ان کی پریشانی رفع ہو جاتی ہے۔

والدین بچے کے عنفوانِ شباب میں دیکھیں گے کہ وہ اپنی ظاہری وضع قطع پر ... توجہ کرتا رہا ہے۔ وہ بچہ جو میلا کچیلا پھرتا رہتا تھا۔ اب گھنٹوں ... میں لگا رہتا ہے۔ لڑکیاں اپنے بال توجہ سے بنائیں گی۔ منہ ہاتھ دھوتی دھلاتی رہیں گی اور صاف ستھرے کپڑے پہنیں گی۔ یہ سب علامتیں اس بات کی ہیں کہ بچے جوان ہو رہے ہیں۔

محبت کی اہمیت :۔ ہم سب کے علم میں ایسی مثالیں ہوں گی جن میں

ناواقفیت کی وجہ سے والدین نے بچوں کی پرورش میں غلطیاں کیں، مگر اس کوتاہی کے باوجود بچے بڑی عمدگی سے پروان چڑھتے رہے۔ اس کے برعکس ایسے والدین بھی ہوتے ہیں جو کوشش کرتے ہیں کہ بچوں کے معاملے میں ان سے کوئی غلطی سرزد ہونے نہ پائے۔ لیکن ان کے بچے اس پر بھی غمگین رہتے ہیں۔ کیوں! اس لیے کہ بچے کے لیے اچھی غذا، رہنے کا آرام وہ انتظام اور صفائی ستھرائی کی تربیت سے محبت کے نقدان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

جب ہم واقعی کسی بچے سے محبت کرتے ہیں تو ہم اس کا لحاظ اس فرد کی طرح کرتے ہیں جس کی ضروریات اور خواہشات ہماری توقعات اور ہمارے ارادوں سے کبھی کبھی مختلف بھی ہوتی ہیں۔

اگر نہلانے کے بعد کوئی بچہ سونا نہیں چاہتا بلکہ کھیلنا چاہتا ہے تو اُسے ضرورت دراصل کھیل ہی کی ہوتی ہے۔ ہر چند کہ وقت بچے کے سونے ہی کا ہو پھر بھی اگر ماں تھوڑی دیر کے لیے بچے کے ساتھ کھیل لے تو اس سے بچے کی نشوونما میں زیادہ مل سکے گی۔

اگر کوئی قبل مدرسہ کی عمر کا بچہ اپنے کپڑے خود پہننا چاہے تو وہ غالباً یہ سمجھتا ہے کہ میں اب بچہ نہیں رہا، اب میں اپنے کام خود کر سکتا ہوں۔ اس کے اس خیال کی تصدیق والدین کو کرنی چاہیئے۔ جوان ہونے والا، وہ بچہ جو ماں کی امداد یا محتاجی سے آزاد ہونا چاہتا ہے، اُس آزادی کا خواہاں ہوتا ہے، جو اُسے بڑی عمر کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار کرتی ہے۔

بچہ بگڑ نہ جائے گا! اکثر والدین دریافت کرتے ہیں کہ اگر ہم بچے

کی ہر خواہش کو ہمیشہ پورا کرتے رہیں تو کیا بچہ بگڑ نہ جائے گا ؟"

بے شک حدود بھی ہوتی ہیں۔ جب بچہ بڑا ہو جائے تو اُسے چند ذمہ داریاں بھی قبول کرنی چاہئیں لیکن اس امر کی شہادتیں موجود ہیں کہ بچہ تو وہ "بگڑتا" ہے جس کی طمانیت بچپن میں نہ ہوئی ہو۔ حالانکہ اس کے لیئے بیش قیمت کھلونے بھی موجود ہوں اور سارے مادی آرام بھی۔ جب بچوں سے محبت نہیں کی جاتی تو وہ بھی مشکل ہی سے محبت کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ساتھ بچپن میں اچھا سلوک نہیں کیا گیا اور آرام سے بھی وہ محروم رہے، مگر جب وہ بڑے ہوئے تو بہت اچھے والدین اور عمدہ شہری بنے۔ بہت کم لوگ اتنی قوی شخصیت کے پیدا ہوتے ہیں جو بچپن کی صعوبتوں سے اپنی سیرت کو مجروح نہیں ہونے دیتے، ورنہ بچپن کی محرومیوں کا نقصان ضرور پہنچتا ہے یہ اور بات ہے کہ لوگ اس کا اظہار نہ کریں اور ان کے مسائل ایسے ہوں کہ دُنیا کو ان کی خبر نہ ہو مگر اپنی ذہنی پیچیدگیوں کی وجہ سے ایسے لوگوں کو دیر سویر کسی نفسیاتی معالج سے رجوع ضروری کرنا پڑتا ہے۔

غور طلب مسئلہ

نفسیاتی امراض کے ایک معالج کے زیر علاج ایک ایسا کروڑ پتی آیا جو بقول دوستوں اور خاندان والوں کے پہاڑ کی طرح مضبوط تھا اُسے علاج کرانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ بعض ایسی جسمانی ناہمواریاں رونما ہو گئیں جن کی وجہ سے

وہ اپنے کام نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ بیمار پڑا تو ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا مگر کسی عضوی یا جسمانی خرابی کا پتا نہ چل سکا۔

اس کی پرورش ناداری میں ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں اس کا باپ مرگیا تھا اور پیٹ پالنے کے لیئے اُسے اُس کی ماں کو بھی نوکری کرنی پڑی تھی جب بچے بے فکری سے کھیلتے کودتے پھرتے ہیں، اس کی ماں کو بھی نوکری کرنی پڑی تھی بچپن کے عام تجربات حاصل کرنے سے وہ محروم رہا مگر بے حد ذمہ داریوں کے بوجھ تلے بھی وہ ترقی کرتا رہا۔ منہ سے چاہے کچھ نہ کہتا ہو مگر دل میں وہ ان سخت ذمہ داریوں سے نفرت کرتا رہا۔

اس کی دلی خواہش یہ رہی کہ میں بڑا ہو کر خوب دولت کماؤں تاکہ میرے بچوں کو میری طرح سختیاں نہ جھیلنی پڑیں اور آرام سے اپنا بچپن بسر کریں۔ اس نے خوب دولت کمائی، پیارے پیارے بچوں کا باپ بنا، اور ان کے لیئے اس نے وہ سکھ اور آرام مہیا کیا جس کا وہ خواب دیکھا کرتا تھا۔

مگر ہم سب کی طرح وہ بھی اپنے بچپن سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ یہی اس کا سب سے بڑا دکھ تھا۔ بچوں کی آسائش کے لیئے اُسے سخت محنت کرنی پڑتی تھی بچوں کو کوئی کام نہ تھا۔ غیر شعوری طور پر اُسے یہ بات ناپسند تھی۔ جب وہ اپنے بچے کو کرکٹ کا میچ دکھلانے لے جاتا تو بچہ خوش ہوتا، اور بچے کی خوشی پہ خود بھی خوش ہوتا، مگر لاشعوری طور پہ اس کا ردِ عمل یہ ہوتا کہ "اس کھیل کو دیکھ کر خوش ہونے کا تجھے کیا حق حاصل ہے؟ ٹکٹ خریدنے کے لیئے تجھے محنت نہیں کرنی پڑی تو مزے اڑاتا ہے اور کوئی کام تجھے نہیں کرنا پڑا۔ میں ساری عمر محنت کر کر کے مرتا رہا۔"

کھوئے ہوئے تجربات کی تلافی

اِس شخص کے علاج میں منجملہ اور باتوں کے ایسے مواقع مہیا کیے گئے جن سے اُسے بعض ایسے تجربے حاصل ہو جائیں جو بچپن میں اُسے حاصل نہ ہو سکے تھے لکڑی پر کندہ کاری کرنے کا اُسے شوق دلایا گیا۔ اُسے دُور دور تک پیدل پھرایا گیا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر اور ملازم اُس سے بڑے تپاک اور اخلاق سے پیش آتے رہے زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ اب کسی اور پر تکیہ کرنے لگا تھا۔ اُسے ایسی باتوں کے سُننے میں لطف آنے لگا کہ "اِس وقت تم سیر کرنے جا سکتے ہو، اور اب تم اپنے کارخانے میں جا کر کام کرو" اُسے یہ اچھا معلوم ہونے لگا کہ کوئی اور اس کے لیے فیصلے کرنے لگا۔

رفتہ رفتہ اُس نے ذمہ داریوں کو دوبارہ قبول کرنا سیکھا۔ اس کی جسمانی ناہمواریاں ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں نفسیاتی علاج کرانے سے وہ خوش و خرم شخص بن گیا کیونکہ اس میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اس عمل میں کئی مہینے لگ گئے۔

تنظیم

لیکن تنظیم اور روک تھام کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچے سکھیں اور ذمہ دار اور پختہ افراد بنیں تو کیا تنظیم اور روک تھام کی ضرورت نہیں ہوتی؟

بچوں کی نشوونما کو صحیح رُخ دینے کے لیے نظم و ضبط بھی ایک حد

تک ضروری ہے۔ سختی یا مار پیٹ کے پرانے اصولوں کو ترک کر کے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں، جن سے بچے کی ضروریات پوری ہو سکیں اور اس کی نشوونما میں آپ مدد کر سکیں۔ یہ طریقے ایسے ہونے چاہئیں جن سے اس کی رہنمائی اور امداد ہو۔ ایسے نہ ہوں جن سے اس میں شکست خوردگی پیدا ہو، اور نہ ایسے جو اس کی صلاحیتوں پہ بار ہوں۔

بچے کی خودسری یا سرکشی کا سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ نشوونما کے اس درجے تک نہیں پہنچا کہ ہمارے مطالبوں کو سمجھ سکے یا اس میں اس درجہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ ہماری توقعات کو پورا کر سکے۔

اگر چار سال کی عمر کا بچہ ہر وقت چلنے والی سڑک کو پھلانگتا ہوا نکل جائے تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اُسے علم نہیں یہ طریقہ غلط ہے، یا وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ طریقہ کیوں غلط ہے یا اُسے بتانا چاہیئے کہ تم اب اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ تمہیں یہ باتیں خود جاننی چاہئیں۔ یقیناً یہ ہمارا فرض ہے کہ سڑک پہ تیز چلنے والی گاڑیوں سے اُسے بچائیں، اور اُسے سڑک پار کرنے سے اس وقت تک باز رکھنا چاہیئے جب تک وہ خود سڑک پہ سے محفوظ گزر جانا نہ سیکھ لے۔ لہذا ہمیں بچے کی ناخوشگوار حرکت کا سبب دریافت کرنا چاہیئے اور اس کوتاہی کو دور کرنا چاہیئے۔ نہ یہ کہ اُسے دھمکایا یا مارا پیٹا جائے۔

خرابیوں یا برائیوں کو دور کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ بچے کو اپنے کیے کی متعلق سزا خود ہی مل جائے، جو بچہ سست ہو اور وقت کی پابندی

ذکر تا ہو اگر گھر والوں کے ساتھ وقتِ مقررہ پر سیر سپاٹے سے رہ جائے تو آئندہ وقت کی پابندی کرنے کا زیادہ لحاظ رکھنے لگے گا۔ اگر کوئی بالغ بچہ اپنے خرچ کا صحیح میزانیہ نہیں بناتا اور اپنی رقم جلد ختم کر دیتا ہے تو اُسے فالتو رقم دی جائے۔ آئندہ بے پروائی سے خرچ کرنے میں وہ محتاط ہو جائے گا۔

جذباتی محرومی کے شکار بچّے

ایسے تباہ کار اور سرکش بچّے بھی ہوتے ہیں جو سالہا سال تک اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ ایسے بچے چاہے ویرسے بخنر ہوں چاہے جلدی اپنی روش نہیں بدلتے۔ ان کا کیا کیا جائے؟

ایسے بچّے طرزِ عمل کی اُلجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے جذبات کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا، یہ بچّے محبّت کے بھوکے ہوتے ہیں۔

اگر انہیں ان کی غلط روی پر سزا دی جائے تو بے سود ثابت ہو گی۔ یہ اپنے غصّے میں آپ ہی کھولتے رہتے ہیں انہیں ضرورت کی ہوتی ہے کہ اپنے دل کا بخار نکال دیں جب تک گھلتے رہیں گے اِن کی گھٹن انہیں بُرے کام کرنے پر مجبور کرتی رہے گی۔

جری کی مثال لیجئے وہ اس قدر تباہ کار لڑکا تھا کہ اُسے ناہموار جذبات والے بچوں کے ایک ادارے میں داخل کرنا پڑا۔

ادارہ میں جری سے کوئی "مت کرو،" نہیں کہتا تھا اگر وہ غصّہ نکالنا

شدید غصے کے احساسات کی عکاسی کے لیے تعمیری مشاغل مہیا کرنا دانشمندی ہے

چاہتا تھا تو اُسے کوئی نہ روکتا تھا۔ اگر وہ بگڑ کر بیٹھ جاتا تو اُسے کوئی نہ ڈانٹتا تھا۔
پڑھانے والے، ڈاکٹر اور ملازم سبھی اُس سے خوش ہو کر بات کرتے
اور خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ کھیلنے کے لیے تعمیری کھلونے اور کھیل موجود
تھے مگر جمی کو مجبور نہیں کیا جاتا تھا کہ ان سے ضرور کھیلے جمی نے ایک زینے
کا کٹہرا توڑ کر پھینک دیا۔ اُسے ڈانٹا نہیں گیا، بلکہ زیادہ مضبوط کٹہرا لگا
دیا گیا۔ جمی نے جب دیکھا کہ کوئی اس کی اس حرکت کی پروا نہیں کرتا تو اس
نے خود ہی توڑ پھوڑ کرنا چھوڑ دیا۔ اس کی اُستانی نے اُسے بلا دیا تھا کہ کسی
تم ہمارے ساتھ سنیما دیکھنے چلنا۔ بہت دنوں کے بعد جمی نے خود ہی اُستانی

کے ساتھ جانا منظور کر لیا۔ اس کے بعد اس کا طرزِ عمل بہتر ہوتا چلا گیا۔

ایک عملی اقدام

اس میں شک نہیں کہ عام گھروں یا اسکولوں میں اتنی زیادہ تخریب کو گوارا نہیں کیا جا سکتا لیکن تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ معمولی حالتوں میں اسی اصول کو برتا جا سکتا ہے۔

نرسری اسکول کے ایک ۴½ سال کے بچے نے تھوڑے سے عرصہ ہی میں جان بوجھ کر کھڑکی کا ایک شیشہ توڑا، چھ گلاس توڑے، اور کئی ریکارڈ توڑ ڈالے۔

ظاہر ہے کہ یہ کم عمر بچہ کسی اندرونی ضرورت وجہ سے ایسی تخریبی حرکتیں کر رہا تھا، اور اپنی جھلاہٹ کو محسوس بھی کر رہا تھا۔

اسکول کے پڑھانے والوں نے ایک چھوٹا کمرہ اس کے لیئے خالی کر دیا اور اس سے کہہ دیا کہ تم جب چاہو اس کمرے کو اپنے کام میں لے سکتے ہو۔ انہوں نے اسے ایک موگری اور بہت سے ٹین کے خالی ڈبے دے دیئے کہ تم خالی وقت میں ان ڈبوں کو کچل ڈالو تاکہ کباڑیئے کے حوالے کر دیئے جائیں۔

لڑکا کمرے میں اکثر آنے جانے لگا اور ڈبوں کے پچکانے کو اپنا "کام" بتانے لگا۔ پھر دوسرے لڑکوں کو بھی بلا کر کہنے لگا اس کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اس "کارخانہ" نے صرف لڑکے کی تخریب کو رفع کر دیا مگر اس

اُلجھن کو دور نہیں کیا جو اس تخریبی عادت کی محرک تھی لیکن اظہار کے اس ذریعہ کے باعث اور استادوں اور لڑکے کی ماں کے درمیان ہفتہ وار مبادلۂ خیالات کے سبب لڑکے کی شخصی اور معاشرتی ہم آہنگی میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔

قدرے تبدیلی کے ساتھ گھر کے اندر ہی اسی سے ملتے جلتے انتظامات کیے جا سکتے ہیں جن سے تخریبی بچے کو اپنے گھٹے ہوئے جذبات خارج کرنے کا موقع مل جائے۔ اور والدین اور استاد بچے کی حرکتوں سے اکثر چشم پوشی تو کرتے ہی ہیں لیکن بچے کو یہ جتا دینا بھی چاہیے کہ ہم تمہارے محسوسات کو سمجھتے ہیں اور اس ضرورت کو بھی کہ تم ان کا اظہار کرنا چاہتے ہو۔

مدد کی ضرورت کب ہوتی ہے

اُلجھے ہوئے بچوں کو جلد از جلد مدد ملنی چاہیے جتنی جلدی بچے کی الجھن کا پتا لگایا جائے گا۔ اتنا ہی زیادہ وقت اس کی مدد کے لیے مل جائے گا۔ اور بچے کی الجھن زیادہ جڑ پکڑنے بھی نہ پائے گی۔ بچوں کے مشاہدوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بچپن کی الجھنوں اور بعد کی جذباتی علالتوں، بے راہ روی اور جرائم میں قریبی تعلق ہوتا ہے۔

کل کے جذباتی علالتوں کے شکار اور کل کے مجرم آج کے اسکولوں اور گھروں میں رہ رہے ہیں۔ اس وقت کی مدد سے بچوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ آئندہ چل کر انھیں اصلاحی اداروں یا جیل میں داخل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

اگر ہم ذاتی طور پر پوری مدد نہیں دے سکتے یا گھٹے ہوئے جذبات کے اخراج کے لیے مناسب راہیں تلاش نہیں کر سکتے تو اس میں کوئی ذلت کی بات نہیں کہ ہم کسی بچوں کی رہنمائی کرنے والے مطب، یا اسکول یا مشیر یا نفسیاتی طبیب سے رجوع کر لیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا جائے گا کہ اپنے بچوں کی پرورش کرنے میں ناکام رہے ہیں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ بگڑتے ہوئے بچے کے لیے کسی ماہر کی مدد یا مشورے کی اہمیت کو ہم جانتے ہیں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم اپنے بچے کی ضرورت کو محسوس کر کے اس کے لیے وہ کچھ مہیا کرنا چاہتے ہیں جسے ہم ذاتی طور پہ مہیا نہیں کر سکتے۔
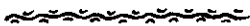
ساتواں باب

پُورے بچّے پر ایک نظر

جب ہم اپنا کوٹ سلوانا چاہتے ہیں تو پہلے اس کے لیے ایک نمونہ پسند کرتے ہیں، پھر اس کے بعد حسبِ ضرورت کپڑا اور استر وغیرہ لیتے ہیں۔

جب ہم بچوں کو پروان چڑھاتے ہیں تو صورت اس سے مختلف ہوتی ہے جب ہم ابتدا کرتے ہیں تو ہمیں چیز بھی ملتی ہے اور نمونہ بھی۔ یہ بڑا ضروری ہے کہ ہم چیز یعنی بچے کا بغور مطالعہ کریں۔ اگر ہم مشاہدہ کرتے رہیں تو اس کا نمونہ یا سانچا بھی ہمارے سامنے آجائے گا۔

مختصر یہ کہ وہ ہمیں بتائے گا کس سمت اُسے بڑھنا ہوگا، اور وہ یہ بھی بتا دے گا کہ اس سمت میں وہ اگلا قدم اُٹھانے کے لیے کب تیار ہوگا

وہ ہمیں یہ بھی بتا دے گا کہ اس میں نشو و نما کی کتنی صلاحیت ہے۔
بچّے کے تیار ہونے سے پہلے ہم اپنے بچّے کو اگلا قدم اُٹھانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے، لیکن ہم اس کا انتظار ضرور کر سکتے ہیں کہ جب وہ تیار ہو جائے تو اس کی راہ میں رکاوٹ نہ ہونے پائے ہم بچّے کو مجبور نہیں کر سکتے کہ اپنی نشو و نما کی حدود سے بڑھ جائے لیکن اس کی مدد کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لائے۔

حقائق سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

جب تک ہم بچّے کے انفرادی نشو و نما کے سانچے کو سمجھ نہ لیں اور تسلیم نہ کر لیں ہم اُسے اس کی صلاحیتوں کے مطابق اس کی نشو و نما میں مدد نہیں دے سکتے۔

- بڑھوتری کو ایک مسلسل آگے بڑھنے والا عمل سمجھنا چاہیے، جس میں بھڑک اُٹھنے اور بجھ کر رہ جانے اور تنزل کرنے وقفے آتے رہتے ہیں۔
- ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بچّہ نشو و نما پانا چاہتا ہے اور نشو و نما کی اُسے ضرورت ہوتی ہے، اور عموماً اس کی نشو و نما اس کے اپنے ڈھنگ سے اور اپنی رفتار سے ہوتی ہے۔
- ہمیں نشو و نما کو ایک کامل عمل سمجھنا چاہیے۔ ایک ایسا عمل جو پورے بچّے پر حاوی ہے، صرف جسم یا ذہن یا جذبات پر نہیں۔

بعض دفعہ والدین یہ دیکھ کر پریشان ہونے لگتے ہیں کہ ایک سال سے اُوپر کی عمر میں بچّے نے بولنا سیکھ لیا تھا مگر یکایک اُس نے نئے لفظ

سیکھنا بند کر دیا، بلکہ جو لفظ اس نے سیکھ لئے تھے اُنہیں بھی وہ بھول گیا۔
ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ اس عمر میں بچّہ اپنے جسم کی نمو اور اعضا کے استعمال میں اس قدر مصروف ہو جاتا ہے کہ الفاظ سیکھنے کی رفتار کچھ عرصہ کے لئے سست پڑ جاتی ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ سنِ بلوغ میں بچّہ اپنے اسکول کا کام پوری طرح نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کی ساری توانائی ایک دم سے قد اور وزن بڑھانے میں صرف ہونے لگتی ہے۔ سنِ بلوغ میں جب جنسی نظام تیزی سے نمو پاتا ہے تو بچّہ صنفِ مخالف سے زیادہ دلچسپی لینے لگتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اِدھر تو ہر بچے میں نشوونما کے مختلف پہلو مختلف رفتاروں سے نمو پاتے ہیں اُدھر بچّہ بذاتِ خود مکمل طور پر بڑھتا رہتا ہے۔ اس کی بڑھوتری کے تمام پہلوؤں میں قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اس کی صحت، اس کی جذباتی نمو، اس کی معاشرتی ہم آہنگی اس کی مکتبی ہمواری، اور اس کی ذہنی نشوونما۔

بچّہ چھوٹے پیمانے کا بزرگ نہیں ہوتا۔

نشوونما کے متعلق ہمیں جو کچھ علم ہو چکا ہے، اُس سے اب ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچّے کو پرانے خیال کے مُطابق ایک چھوٹے پیمانے کا بزرگ سمجھا جاتا ہے، کس قدر غلط تصوّر ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچّے "چھوٹے مرد" اور "چھوٹی عورتیں" ہوتے ہیں، اور ان کے محسوسات اور ضروریات بزرگوں جیسی ہوتی ہیں بس فرق صرف مقدار کا ہوتا ہے۔ اب ہمیں اس کا علم ہے۔

کر نمو کے زمانے میں نیچے نہ صرف بڑے اور قوی ہوتے جاتے ہیں بلکہ کیفیت
کے لحاظ سے بھی بڑھتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ جسمانی طور پر تبدیلیاں نہ صرف
جسم کے مختلف اعضا میں ہوتی ہیں بلکہ ان کی ساخت اور اعضائی کارکردگی میں
بھی احساسات التصورات اور معاشرتی ردِعمل میں بھی کیفیاتی تبدیلیاں ہوتی رہتی
ہیں۔

پختگی کی جانب

بچے کے اندر نمو کی قوتوں کو جان کر اور ان قوتوں کو آگے بڑھنے کا زیادہ
سے زیادہ موقع دے کر ہم بچے کو اُس مقام تک پہنچنے میں مدد دے سکتے ہیں،
جہاں پہنچ کر وہ اپنے طرزِ عمل پہ قابو پاسکتا ہے، اور دوسروں کی ضروریات اور حقوق
کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو محدود کر سکتا ہے۔ جب وہ اس مقام پہ
پہنچ جائے تو سمجھیے کہ اُس نے پختگی حاصل کر لی۔

جب بچے میں اندرونی طور پہ قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو
اُسے اپنے فیصلے خود کرنے کی اجازت دے دینی چاہیئے اسکول اور گھر میں
معاشرتی ذمہ داریاں اختیار کرنے کی آزادی اُسے مل جانی چاہیئے۔ والدین اور
معلم ایسے بہت سے مواقع مہیا کر سکتے ہیں جن سے بچوں کو اپنی راہ خود
متعین کرنے کی مشق حاصل ہو سکتی ہے۔ جب بچے پختہ ہونے لگیں تو بچے
اپنے دوست بنانے کی ذمہ داری خود لے سکتے ہیں۔ پڑھنے اور کھیلنے کے
لئے بچے اپنے وقت کو دانشمندی سے خود تقسیم کر سکتے ہیں۔ اپنا روپیہ پیسہ
عقلمندی سے صرف کرنا سیکھ سکتے ہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے بڑوں کی محتاجی

سے چھوٹتے جائیں گے اور اپنے کاموں کو خود بخود ہی نمٹانے لگیں گے جب بچہ اپنے کاموں پر خود قابو پانے لگے تو ہمیں اپنے اختیار کو کم کرتے جانا چاہیئے۔

ہمارا کام ــ اور اس کا صلہ

اگر کسی وجہ سے بچہ مناسب نشوونما نہ پائے تو ہمیں اس کے اسباب معلوم کرنے چاہئیں۔ اگر کوئی جسمانی خرابی یا نقص اس کا باعث ہو تو اس کا علاج کیا جا سکتا ہے، اور ہمیں اس کا علاج جلدی کرنا چاہیئے۔ اگر ہم اس کا علاج نہ کر سکیں تو ہمیں بچے کو مکمل طور سے پیش نظر رکھنا چاہیئے اور اس کے نقص کی وجہ سے جو کمی ہو گئی ہو اسی گنجائش میں اُسے نشوونما حاصل کرنے میں مدد دینی چاہیئے۔ اگر اُسے زیادہ توجہ اور محبت کی ضرورت ہو تو اس کے لیئے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ اُسے توجہ اور محبت زیادہ مل جائے۔ اگر ہم اس کی نمو کی منزل سے زیادہ اُس سے مطالبہ کر رہے ہوں تو ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے اور اُس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے جب وہ ہماری توقعات کو پورا کرنے کا اہل ہو جائے۔ سست رفتاری سے بڑھنے والے ہمیشہ ہی پیچھے نہیں رہ جاتے۔ بعض دفعہ ان کا آغاز سُست ہوتا ہے، لیکن جب وہ پختگی کو پہنچتے ہیں تو دوسروں کو جا لیتے ہیں۔

والدین اور اُستادوں کے لیئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی کی بات ہو سکتی ہے کہ وہ سنبھلے ہوئے بچے کو سنبھلا ہوا جوان دیکھیں اور اغلب

یہ ہے کہ سنبھلا ہوا جوان سنبھلے ہوئے بچوں کا باپ بنے گا، اور یہ نتیجے بھی یقینی ہے کہ اچھے والدین ثابت ہوں گے۔ آہستہ آہستہ اس طرح اور صرف اسی طرح نسلِ انسانی بہتر سے بہتر ہو سکتی ہے۔
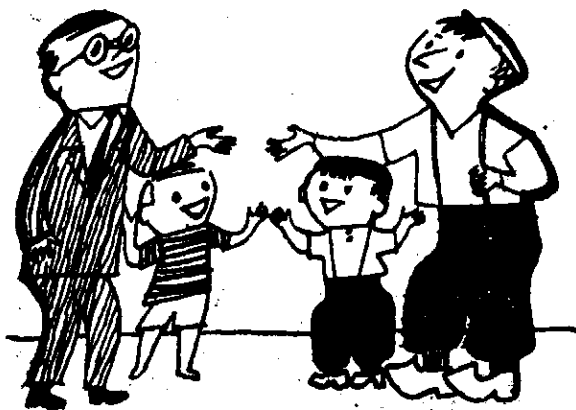
آج کا سنبھلا ہوا بچہ کل کی دنیا کا پختہ شہری ہو گا۔

والدین اور معلمین کے لئے ایک سوالنامہ

بچوں کی نشوونما کے بارے میں آپ کو کتنا علم ہے؟

ہدایات:۔ ہر سوال میں چار باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک کا انتخاب کیجئے جسے آپ اپنی دانست میں صحیح سمجھتے ہوں، اور اس کے ابتدائی حرف پر نشان لگا دیجئے

(۱) "نشوونما" سے ہمارا مقصد ہوتا ہے۔

(الف) قد اور وزن میں اضافہ

(ب) دوسروں کے ساتھ ترقی کرنے کے لیے بچے کی قابلیت میں تبدیلی

(ج) اپنے اوپر قابو رکھنے میں ترقی

(د) پڑھنا لکھنا

(ہ) مذکورہ بالا تمام امور

(۲) وسطی طفولیت کا اطلاق اس عہد پہ ہوتا ہے۔

(الف) پیدائش سے ۵ سال کی عمر تک

(ب) ۶ سے ۱۰ سال کی عمر تک

(ج) ۱۰ سے ۱۳ سال کی عمر تک

(د) ۱۳ سے ۱۵ سال کی عمر تک

(۳) "دانشِ جسم" سے مراد یہ میلان ہوتا ہے

(الف) بھوک لگنے پہ غذا اور پیاس لگنے پہ پانی تلاش کرنا۔

(ب) حساب کرنے کی ودیعتی صلاحیت

(ج) اپنے آباؤ اجداد کے تجربات کو یاد رکھنا۔

(د) مشینی چیزوں کو جان جانا۔

(۴) بچپن کی عام علالتیں

(الف) نشوونما کو مستقلاً روک دیتی ہیں

(ب) نشوونما پہ کم اور عارضی اثر کرتی ہیں

(ج) آسانی سے رو کی جا سکتی ہیں
(د) اس لائق نہیں ہوتیں کہ ان کی طرف توجّہ کی جائے
۵:۔ اگر بچہ سست اور مٹھس پڑھنے والا ہو تو آپ کو چاہیئے۔
(الف) گھر پر اُسے بار بار الفاظ یاد کرائیں۔
(ب) اُستاد کو قصور وار ٹھہرائیے
(ج) اُسے ڈانٹیں اور بہتر کام کرنے کی تاکید کریں
(د) اگر اُسے مدد کی ضرورت ہو تو اُسے مدد دیں اُس کی الجھنوں کو وقت، لو، اور اسکول پر چھوڑ دیں
۶:۔ بچوں میں نشو و نما کے جو فرق ہوتے ہیں۔
(الف) حقیقی اور اہم نہیں ہوتے
(ب) کھلا پلا کر اور مشق کرا کے دور کرنے چاہئیں
(ج) گھر میں اور اسکول میں ان کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔
(د) ان کا اثر اسکول کے کاموں پر نہ پڑنا چاہیئے۔
۷:۔ اسکول کے وقت کے علاوہ اگر مزید وقت اور مدد دی جائے تو اسکول میں بچّے کی صلاحتیں بڑھ سکتی ہیں، اس صورت میں کہ بچّے کو۔
(الف) اُن نئے طریقوں سے پڑھایا گیا ہو جو تعلیم کے لیئے جدید اسکولوں میں رائج ہیں۔
(ب) ابتدا میں کافی تجربے حاصل نہ ہوئے ہوں
(ج) عینک لگانی پڑتی ہو۔

(د) اسکول کی کلاس میں کافی روشنی نہ ملتی ہو۔

۸:۔ ایسا اسکول جس میں جدید طریقۂ تعلیم رائج ہو۔

(الف) ہر کلاس میں ہر بچے سے ایک ہی کسا کام کرانے پر منحصر ہوتا ہے۔

(ب) ایسی تعلیم دیتا ہے، جس سے بچے کی نمو میں ترقی ہو۔

(ج) پڑھنے لکھنے اور حساب کے سوال حل کرانے کو اہمیت نہیں دیتی

(د) بچوں کو اُن کاموں کے کرنے پر مجبور کرتا ہے جن میں وہ فیل ہو جاتے ہیں۔

۹۔ بچوں کی سیرت کو اُس وقت بہتر طریقہ پر سمجھا جا سکتا ہے، جب محسوس کر لیا جائے کہ

(الف) بچے کی عمر ہی سے اس کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(ب) عادتوں کی تربیت ہی سے بچے کو آپ حسبِ مرضی رُخ دے سکتے ہیں۔

(ج) بچے کئی طریقوں اور مختلف رفتاروں سے بڑھتے ہیں اس لئے ماہ و سال کے لحاظ سے بچوں کی عمر ایک ہوتے ہوئے بھی ان کی نموئی عمر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

(د) ذہنی عمر سے پتا چلایا جا سکتا ہے کہ بچہ کیا کر سکے گا۔

۱۰۔ معاشرتی اہلیت یا معاشرتی عمر سے مطلب ہوتا ہے

(الف) اپنے کاموں کا انتظام خود کرنے کی قابلیت کی نمو۔

(ب) دوسروں میں ہر دل عزیز ہونا۔
(ج) خوش اخلاقی کے اصولوں کا علم
(د) کج روی کے میلانات

(۱۱) آج کل کے ابتدائی اسکولوں میں آرٹ، موسیقی اور کھیلوں کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ

(الف) قابلِ قبول طریقے سے بچہ اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کو خارج کرتا ہے۔
(ب) جدید دُنیا میں بچہ مسابقت کا مفہوم ذہن نشین کرے
(ج) بچے کو کامیابی اور ناکامی کا احساس ہوتا رہے۔
(د) بچے کو قواعد وضوابط کے معنی معلوم ہو جائیں

۱۲۔ بچے کو اگر والدین بے عذر جوں کا توں قبول کر لیں۔ اور بے روک ٹوک اُسے اپنی من مانی کرنے دیں تو:۔

(الف) بچہ سست ہو جاتا ہے اور ضرورت سے زیادہ سہارا تلاش کرنے لگتا ہے۔
(ب) اسکول میں اس کی ترقی تیزی سے ہو گی۔
(ج) بچہ یا تو تنہائی پسند اور اطاعت گزار (ضرورت سے زیادہ تک) ہو جائے گا یا سرکش اور تباہ کار
(د) بچہ خوش رہے گا اسے ذہنی آسودگی حاصل ہو گی، اور اپنی پوری صلاحیت سے پڑھتا رہے گا۔

(الف) جو اپنے اوپر قابو رکھنے میں بچے کی مدد کرے۔
(ب) جو بچے کو والدین اور معلمین کا کہا ماننے پہ آمادہ کرے
(ج) جس سے بچے خاموش رہیں۔
(د) جس کا قبضہ بچے کے ارادے پہ ہو جائے۔

صحیح جوابوں کے لیے اس کتاب کو اُلٹ دیکھیں۔

(۱) ——— ہ
(۲) ——— ب
(۳) ——— ا
(۴) ——— ب
(۵) ——— د
(۶) ——— ج
(۷) ——— ب
(۸) ——— ب
(۹) ——— ج
(۱۰) ——— ا
(۱۱) ——— ا
(۱۲) ——— د
(۱۳) ——— ج
(۱۴) ——— ج
(۱۵) ——— ا